قرآن کریم اور سنّتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

# بیّنات


جلد: ۸۳ شمارہ: ۸، ۹

شعبان ورمضان: ۱۴۴۱ھ - اپریل، مئی: ۲۰۲۰ء

قیمت شمارہ ہذا: ۸۰ روپے ، زرِسالانہ: ۵۰۰ روپے



مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبد الرزّاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سیّد سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمّد اعجاز مصطفی

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی



**خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ**

دفتر ماہنامہ ’’بینات‘‘ جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ’’بینات‘‘: 021-34927233

**اکاؤنٹ نمبر**

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-0101900 برانچ کوڈ: 00816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی



**بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک**

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ
انڈیز وغیرہ : 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا
وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر



جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

**فون:** 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

**فیکس:** 92-21-34919531 +

***Web***: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk



**ناشر:** مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

# فہرستِ مضامین


## بصائر و عبر

| | | |
|---|---|---|
| ''کروناوائرس'' آفتِ سماوی!!! | ۳ | محمد اعجاز مصطفیٰ |

## مقالات و مضامین

| | | |
|---|---|---|
| نظامِ عالم اور عدل وانصاف | ۱۲ | محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ |
| سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ | ۱۸ | انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری |
| حضرت علّامہ بنوریؒ... بلند پایہ محدّث... ادیب... مہتمم (قسط:۳) | ۲۱ | مفتی عبدالرؤف غزنوی |
| کروناوائرس اور نبوی تعلیمات! | ۳۳ | مفتی رفیق احمد بالاکوٹی |
| قرآن کریم کا تعارف! اور ہماری ذمہ داری | ۳۷ | ڈاکٹر مفتی محمد نجیب قاسمی سنبھلی |
| معاملات سے ابہام دور کیجیے! | ۴۳ | مفتی محمد اویس ارشاد |
| رکعاتِ تراویح بیس یا آٹھ.....! | ۴۹ | مولانا احسان اللہ احسان |
| علوم حدیث میں تصانیف کا آغاز! | ۶۱ | مولانا شایان احمد |
| خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ | ۶۷ | مولانا عبدالمنان معاویہ |
| دین اسلام کے اساسی وآفاقی تصورات | ۷۳ | مولانا عبدالمتین |
| معاشرے کی اصلاح وبگاڑ پر مالی رویوں کے اثرات (قسط:۲) | ۸۰ | مولانا محمد طفیل کوہاٹی |
| مرابحہ مؤجّلہ.... ارتقائی، واقعاتی اور تجزیاتی مطالعہ (قسط:۵) | ۸۷ | مولوی فضل الرحمٰن |

## یادِ رفتگاں

| | | |
|---|---|---|
| حضرت مولانا حبیب اللہ قربان مظاہری رحمۃ اللہ علیہ | ۹۵ | مولانا سید سلیمان یوسف بنوری |
| خانوادۂ کامل پوریؒ کے عظیم فرزند کی رحلت | ۱۰۵ | مفتی خالد محمود |

## دار الافتاء

| | | |
|---|---|---|
| سپر مارکیٹ میں کارڈ اور پوائنٹس پر ڈسکاؤنٹ کا حکم | ۱۱۳ | ادارہ |

## نقد و نظر

| | | |
|---|---|---|
| | ۱۱۵ | ادارہ |

# ’’کرونا وائرس‘‘ آفتِ سماوی!!!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

**الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی**

دنیائے انسانیت پر جو مصائب وآلام آتے ہیں‘ علمائے کرام اصولاً ان کی تین اقسام بیان کرتے ہیں: ا:-غیر اختیاری مصائب، ۲:-اختیاری مصائب، ۳:-وہ مصائب جو شرعی اعمال وافعال کی اعلانیہ خلاف ورزی پر اس کے مقنن وحاکم کی طرف سے بطور پاداشِ عمل ڈالے جاتے ہیں۔

ا:-غیر اختیاری مصائب جو انسان کے ارادہ واختیار کے بغیر اس پر طاری ہوتے ہیں، خواہ انسان کتنا ہی معتدل مزاج، معتدل اخلاق اور معتدل افعال کیوں نہ ہو، جیسے موسم کے ردوبدل سے پیدا شدہ امراض یا رات دن کی گردشوں سے سرزدشدہ احوال۔ ان میں نہ انسان کے ارادہ وفعل کو دخل ہے اور نہ ہی ان میں انسان کی تخصیص ہے۔ یہ تغیرات جمادات ونباتات، معدنیات وحیوانات، ارضیات وفلکیات، پھر انسانوں میں بالغ ونابالغ، بچہ وبڑا، متقی اور فاجر سب میں برابر ہیں۔ ان مصائب سے خود کو بھی اذیت پہنچتی ہے اور دوسروں کو بھی۔ گویا یہ مصائب انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی، لازمی بھی ہیں اور متعدی بھی، ذاتی بھی ہیں اور اضافی بھی۔ غور کیا جائے تو یہ مصائب نہیں، بلکہ موسمی تغیرات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے کائنات میں نمایاں ہوتے ہیں اور یہ تغیرات اس عالم کی خاصیت ہے جو اس سے جدا نہیں ہوسکتی، اسی لیے ان کا نام تکوینی تغیرات رکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔

۲:-اختیاری مصائب ہیں جو انسان کے تصرفات اور کسب وعمل سے اُبھر کر اس کی ذات میں

بھی نمایاں ہوتے ہیں اور آفاق میں بھی ۔ اس کا سبب اس عدل واعتدال کی خلاف ورزی ہے جو ہر انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے ۔ خواہ وہ بے اعتدالیاں ان طبعی افعال میں نمایاں ہوں جن کا تقاضا انسان کی طبیعت کرتی ہے، جیسے: کھانا، پینا، سونا، جاگنا، جماع ومباشرت ۔ یا ان افعال میں نمایاں ہوں جن کا تقاضا عقل کرتی ہے، جیسے: مفادِ عامہ، اجتماعی، سیاسی اور قومی اُمور، تمدنی ترقیات، بین الاقوامی معاملات، وسائلِ زندگی کا نظم، ایجادات واختراعات، عمومی تجارت، اقتصادیاتِ عامہ اور کھانے پینے وغیرہ کے پرتکلف اور نئے نئے انداز وغیرہ، یہ تمام جزئیات بھی اُمورطبعیہ میں سے ہیں، لیکن جب یہ کلی اور عمومی صورت اختیار کرلیتی ہیں تو ان میں طبیعت کے ساتھ عقل کا بھی دخل آجاتا ہے اور وہ اُمورعقلیہ کہلانے لگتی ہیں ۔ غرض طبعی اور عقلی اُمور میں اس عدمِ اعتدال یعنی افراط وتفریط کے منفی آثار بصورتِ آفات انسان پر پڑتے ہیں، جو اسی کی بے اعتدالیوں کا ردِعمل ہوتی ہیں، اس لیے انہیں اکتسابی آفات کہنا چاہیے ۔

۳: - تیسری قسم کے مصائب وہ ہیں جو شرعی افعال کی خلاف ورزی کے نتیجے میں انسان پر آتے ہیں، یعنی کسی تشریعی قانون کی اعلانیہ اور مسلسل خلاف ورزیوں پر اس کے مقنن اور حاکم کی طرف سے بطور پاداشِ عمل ڈالے جاتے ہیں ۔ پس جب بھی اس قانونِ الٰہی کی مخالفت رونما ہو اور اُمورِ شرعیہ میں کھلے بندوں افراط وتفریط سے کام لیا جانے لگے، تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آفات وبلیات کا ظہور ہوگا، مثلاً: جب اللہ تعالیٰ کے احکامات ماننے کی بجائے کھلے عام اس کی مخالفت کی جائے گی ۔ ظلم کو انصاف کہہ کر نافذ کیا جائے گا ۔ ہدایت کی بجائے ضلالت کا رواج اور دور دورہ ہوگا ۔ حق وصداقت کی بجائے جھوٹ، فریب اور دغا کی پیروی ہوگی ۔ ایفائے عہد کی بجائے وعدہ خلافی کا دور دورہ ہوجائے ۔ عدل کی بجائے ظلم وستم کا بازار گرم ہوجائے ۔ امن کی بجائے بدامنی وغارت کی دھوم ہوجائے ۔ پاکیزگیِ نفس کی بجائے ناپاکیِ نفس اور خبثِ باطنی پیدا ہوجائے ۔ حیا کے بجائے بے حیائی، عفت کی بجائے فحش پھیل جائے ۔ مال کی عصمت مفقود ہوجائے، چوری، ڈکیتی کا بازار گرم ہوجائے ۔ جان کی عصمت نہ رہے، قتل وغارت پھیل جائے ۔ استغناء کے بجائے عدمِ استغناء یعنی استعماریت پھیل جائے ۔ نافرمان انسانوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی زمین بے آئین ہوجائے، جس میں قانون کی بجائے لاقانونیت اور نورِ فطرت کی بجائے ظلمتِ نفس ہو ۔ غرض یہ کہ خواہشات ونفسانیت کی تمام حدیں عبور ہوجائیں اور یہ انسانی نفس، وجودی اُمور اور بارگاہِ وجود سے منحرف ہوکر عدم کی طرف بڑھنے لگے تو حضرت واجب الوجود کی طرف سے وجودی نعمتیں سلب ہونی شروع ہوجاتی ہیں اور زمین وآسمان کے عدمی آثار بصورتِ مصائب اس عدمی نفس سے آملتے ہیں ۔ اگر احکاماتِ شرع کی خلاف ورزی اور

معصیتِ ربی انفرادی ہوگی تو عذابِ خداوندی بھی انفرادی طور پر تکوینی راستہ سے آئے گا اور اگر خلاف ورزی قومی اور اجتماعی رنگ کی ہوگی تو وبال ونکال بھی اجتماعی حیثیت سے سامنے آئے گا، اس لیے ان آفات کو انتقامی تعزیرات کہنا چاہیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''لَیَأْتِیَنَّ عَلٰی أُمَّتِيْ کَمَا أَتٰی عَلٰی بَنِيْ إِسْرَائِیْلَ حَذْوَالنَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰی إِنْ کَانَ مِنْھُمْ مَّنْ أَتٰی أُمَّہٗ عَلَانِیَۃً لَکَانَ فِيْ أُمَّتِيْ مَنْ یَّصْنَعُ ذٰلِکَ.'' (رواہ الترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، ص:۳۰)

''ضرور بالضرور میری اُمت پر بھی وہ حالت آئے گی جو بنی اسرائیل پر آئی، جیسے ایک جوتا دوسرے کے برابر ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی اپنی ماں سے اعلانیہ بدکاری کا مرتکب ہوا ہوگا تو میری اُمت میں بھی کوئی ایسا ہوگا جو یہ کام کرے گا۔''

بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آج کا مسلمان عموماً چاہے وہ حکمران ہو یا عوام، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق بالکل پہلی قوموں کی ڈگر پر چل رہا ہے، اسے نہیں پرواہ کہ ہمارا دین کیا کہتا ہے؟ ہماری کتاب میں ہمارے لیے کیا احکامات ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کیا ہدایات دی ہیں؟۔ آج کا مسلمان عموماً انفرادی اور اجتماعی طور پر جس طرح اسے اپنے مسلمان ہونے کی ذمہ داریاں ادا کرنی چاہئیں، ویسے وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کررہا، جس کی بنا پر کفار کا اُن پر تسلُّط بڑھتا جارہا ہے اور اس تسلُّط کی وجہ سے مسلمان معاشرہ کو غیرشعوری طور پر ایسی چیزوں میں مشغول کردیا گیا ہے جو اسلامی تعلیمات کے بالکل مخالف ہیں۔ کفر اسلام پر ایسے پوشیدہ وار اور حملے کرتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو پتہ ہی نہیں چلتا اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی فکر، سوچ، عقیدہ اور نظریہ بدل جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ ان کے کنٹرول میں ہیں، جن سے وہ مسلمان معاشرے، سوسائٹیز، اداروں اور حکومتوں میں اپنی ارتدادی مہم اس انداز میں چلاتے ہیں کہ مسلمانوں کی عقل، فکر، سوچ اور نظریات میں تبدیلی آنا شروع ہوجاتی ہے، جس سے اسلام کی وہ محکم اور مضبوط بنیادیں جن پر صدیوں سے اتفاق چلا آرہا ہے، ان کے بارہ میں مسلمان شکوک وشبہات میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ظاہر ہے جہاں شک آجائے وہاں ایمان کی چھٹی ہوجاتی ہے۔ آج عالم دنیا پر چہار سو نظر دوڑائیں تو نظر آئے گا کہ ہر جگہ خالقِ کائنات کی معصیت ونافرمانی خصوصاً مسلمانوں پر جو ظلم وستم اور کشت وخون کے دریا بہائے جارہے ہیں، ان کے ردِ عمل میں تعزیراتِ الٰہیہ بصورتِ آفات ظاہر ہورہی ہیں اور دنیا تباہ ہورہی ہے۔

آج پوری دنیا میں کرونا وائرس پھیل چکا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ اس کی کیا علامات ہیں؟ اس کا علاج کیا ہے؟ کہاں سے شروع ہوا؟ احتیاطی تدابیر کیا ہیں؟ ان وباؤں کی صورت میں علماء کرام، حکومتِ وقت اور عوام کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ وبائیں کیوں آتی ہیں؟ اور شریعت کی روشنی میں ان کا

کیا علاج ہے؟ ہر ایک کا جواب ذیل میں اجمالاً تحریر کیا جاتا ہے۔

ا:...... بتایا گیا ہے کہ ''کرونا وائرس'' یہ ایک جرثومہ ہے جو خوردبین میں نصف دائرہ کی شکل میں نظر آیا اور اس کے کنارے پر ایسا اُبھار ہے جو تاج کی شکل کے مشابہ ہے۔ چونکہ رومن زبان میں تاج کو کراؤن کہتے ہیں، اس لیے اس وائرس کا نام ''کرونا وائرس'' رکھ دیا گیا۔ مذکورہ وائرس کے نام کی وجہ اور تعارف کے حوالے سے دیگر آراء بھی سامنے آرہی ہیں۔

۲:......اس وائرس کی جو علامات بتائی گئی ہیں: وہ یہ کہ بخار، کھانسی، نزلہ، گلے کی خراش اور وائرس کے شدید حملے کی صورت میں سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ کرونا وائرس سانس کی اوپری نالی پر حملہ کرتے ہوئے سانس کے داخلی نظام کو متأثر کرتا ہے اور انسان جان لیوا نمونیا یا فلو میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

۳:......اب تک اس کی کوئی دوا، علاج یا ویکسین ایجاد نہیں ہوئی، ایک خبر آئی ہے کہ امریکہ نے اس کی ویکسین تیار کر لی ہے اور اب کچھ عرصہ بعد پوری دنیا میں وہ سپلائی کی جائے گی۔ اور ایک خبر یہ ہے کہ جاپان نے بھی اس کی دوائی تیار کر لی ہے اور چار دن میں مریض آدمی اس دوائی کے ذریعہ کرونا وائرس سے صحت یاب ہوجاتا ہے۔ خبر ملاحظہ فرمائیں:

''ٹوکیو (امت نیوز) دنیا کے ساڑھے سات ارب انسانوں کو جس خوش خبری کا انتظار تھا وہ بالآخر بدھ کو سامنے آئی ہے اور جاپانی کمپنی کی انفلونزا کے لیے تیار کردہ دوائی ''فیوی پرورہ'' (Fevi Perora) کے استعمال سے کرونا کے مریض صرف ۴ دن میں مکمل صحت یاب ہونے لگے ہیں۔ چینی ماہرین نے اعلان کیا ہے کہ جاپانی کمپنی کی انفلونزا کے لیے تیار کردہ دوائی کرونا وائرس کے مریضوں کے لیے مؤثر ثابت ہورہی ہے۔ فیوجی فلم کی ذیلی کمپنی کی تیار کردہ انفلونزا کی دوائی ووہان میں ۳۴۰ مریضوں پر آزمائی گئی اور اس دوائی کے استعمال سے صرف ۴ روز کے اندر کرونا کے مریض مکمل صحت یاب ہوگئے۔ چینی وزارتِ سائنس وٹیکنالوجی کے اعلیٰ عہدیدار ینگ زی من نے تصدیق کی ہے کہ جاپانی کمپنی کی دوائی کے حیرت انگیز نتائج سامنے آئے ہیں۔ ''فیوی پرورہ'' نامی دوائی کے استعمال سے کرونا کے مریضوں کے پھیپھڑے فوری طور پر ری کور ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ خبر سامنے آنے کے بعد جاپانی کمپنی فیوجی کے شیئر بدھ کو تیزی سے اوپر جاتے نظر آئے۔'' (روزنامہ اُمت کراچی، ۱۹ مارچ ۲۰۲۰ء)

۴:......چین کے مرکز برائے انسدادِ امراض واحتیاطی تدابیر کے ڈائریکٹر گاؤ خو نے کہا ہے یہ وائرس چین کے شہر ووہان کی ایک سمندری خوراک مارکیٹ میں جنگلی جانوروں سے پھیلا۔ اس مارکیٹ میں مختلف قسم کے جنگلی جانور مثلاً: لومڑی، مگرمچھ، بھیڑیے اور سانپ فروخت کیے جاتے ہیں۔ اس پر بحث ہورہی ہے کہ یہ جان لیوا وائرس قدرتی ہے یا سائنسدانوں نے خود اسے تخلیق کیا ہے۔

امریکہ اور چین اس حوالے سے ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نیا کرونا وائرس نہ صرف انسانی تخلیق کردہ ہے، بلکہ ایک مریکی لیبارٹری نے یہ وائرس چین کو فروخت کیا تھا اور یہ دعویٰ کرنے والے بھی ایک امریکی ہی ہیں، گویا یہ ایک بائیولوجیکل جنگ ہے۔ اور یہ بھی الزام لگایا جارہا ہے کہ اس کراؤنا وائرس کے ذریعہ دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف معاشی جنگ لڑرہی ہیں اور پوری دنیائے انسانیت ان کے ہاتھوں یرغمال اور ان کی تجربہ گاہ بنی ہوئی ہے۔

۵:...... چونکہ یہ متعدی مرض ہے اور اس کا وائرس حیوان سے انسان میں منتقل ہونے، انسان کو بیمار کرنے اور دوسرے انسانوں میں منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے احتیاطی تدابیر کے طور پر بتایا گیا کہ انسان اپنے ناک اور منہ کو ماسک وغیرہ سے ڈھانپے، دوسروں سے ملنے جلنے میں احتیاط کرے، مجمع اور رش والی جگہوں میں نہ جائے، وقفے وقفے سے ہاتھ دھوتا رہے۔ ہمارے پاکستانی طلبہ جو چین میں پھنسے ہوئے ہیں، ماشاء اللہ! وہ تمام صحت مند ہیں اور انہوں نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ ہم پانچ وقت وضو کرتے تھے، اس لیے اس وائرس سے ہم محفوظ رہے۔

۶:...... احتیاطی تدابیر اپنے دائرے میں اپنی جگہ درست، بلکہ شریعت کا حکم بھی ہیں، لیکن احتیاطی تدابیر کے نام پر دینی مراکز ومعاہد اور مساجد ومدارس میں دینی تعلیمات اور دینی اخلاق کی تعلیم وتعلم کو یکسر موقوف کرنا اور ان پر بے جا پابندیاں لگانا شرعاً واخلاقاً کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔ راقم الحروف اپنی دانست میں سمجھتا ہے کہ ان حالات میں عالمِ اسلام کے عموماً اور پاکستان کے خصوصاً، علمائے کرام کی ذمہ داری تھی کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں حکومت اور قوم کی ہر پہلو سے راہنمائی کرتے، بروقت نہ انہوں نے حکومت کی راہبری کی اور نہ ہی قوم کی پوری پوری رہنمائی فرمائی۔ اسی لیے حکومت نے ایسی چیزوں پر بھی پابندی لگانی شروع کردی، جو کسی بھی اعتبار سے اس کے لیے درست نہیں۔ علمائے کرام کی ذمہ داری تھی کہ وہ عوام کو بتاتے کہ وبائی امراض کا پھیلنا حقیقت ہے، ان سے بچنے کی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا بھی شریعت کا حکم ہے، یہ ضرور اختیار کی جائیں، لیکن یہ مؤثر حقیقی نہیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور توکل وتقدیر کے بنیادی ایمانی نظریئے کو مضبوطی سے تھاما جائے۔ وقت سے پہلے اعصابی شکست تسلیم کرنے، مایوسی، توہم پرستی اور قوم کو نفسیاتی مریض بنانے سے بچا جائے۔ انہیں بتایا جاتا کہ شریعت میں جہاں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے فروعی احکام ہیں، وہیں عقائد سے متعلق اصولی احکام بھی شریعت کا حصہ ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

ا-’’قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ.‘‘ (التوبۃ:۵۱)

ترجمہ: ’’تو کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لیے، وہی ہے

کارساز ہمارا، اور اللہ ہی پر چاہیے کہ بھروسہ کریں مسلمان۔‘‘

۲-’’کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً وَّاِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ‘‘ (الانبیاء:۳۵)

ترجمہ: ’’ہر جی کو چکھنی ہے موت اور ہم تم کو جانچتے ہیں برائی سے اور بھلائی سے آزمانے کو اور ہماری طرف پھر کر آجاؤ گے۔‘‘

۳-’’قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِھِمْ وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ‘‘ (آل عمران:۱۵۴)

ترجمہ: ’’تو کہہ اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھ دیا تھا مارا جانا اپنے پڑاؤ پر اور اللہ کو آزمانا تھا جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور صاف کرنا تھا اس کا جو تمہارے دل میں ہے اور اللہ جانتا ہے دلوں کے بھید۔‘‘

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

۱-’’اچھی طرح جان لو! اگر ساری اُمت تم کو نفع دینے کے لیے جمع ہوجائے تب بھی اللہ تعالیٰ کے لکھے ہوئے سے زیادہ نفع دینے پر قدرت نہیں رکھ سکتی اور اگر ساری اُمت تم کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوجائے تب بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق ہی نقصان پہنچا سکے گی، اس سے زیادہ نہیں۔‘‘

۲-’’نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون وغیرہ سے نمٹنے کے سلسلے میں یہ ہدایت ارشاد فرمائی ہے کہ جہاں طاعون پھیل جائے وہاں سے کوئی باہر نہ جائے اور باہر والے طاعون کے علاقے میں داخل نہ ہوں۔‘‘

۳-’’اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ‘‘ ترجمہ:..... ’’اور مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ذریعہ۔‘‘

۴-’’نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کوئی سخت اور ناگوار بات پیش آتی تو آپ علیہ السلام فوراً نماز کے لیے دوڑتے تھے۔‘‘

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے ہمارے لیے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ کورونا وائرس کے حملے کے موقع پر ہم بھی نماز کی طرف دوڑنے والے ہوں، مساجد کو آباد کرنے والے ہوں۔

۷:......حکومت کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ عوام کی سہولیات کا انتظام کرے، ان کے علاج معالجہ، خوراک، امن وامان اور ان کی حفاظتی تدابیر کو مؤثر بنائے، لیکن حکومت کو یہ اختیار نہیں کہ مساجد میں پنج وقتہ نماز اور نمازِ جمعہ بالکل موقوف کرادے۔

بہرحال محض خدشات کی بنا پر مساجد کو بند کرنا اور نماز وجمعہ کی پابندی لگانا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسے احکامات نہ دے جو شرعاً جائز نہیں۔

۸:......عوام کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرے، گزشتہ اعمال پر توبہ اور استغفار کرے اور آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہیں، نمازوں کا اہتمام کریں، صدقات کی کثرت کریں، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

’’إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ۔‘‘ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ، ص:۱۶۸)

ترجمہ: ’’صدقہ رب کے غصہ کو بجھاتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔‘‘

..............................................

مدارس ومساجد اور جامعات میں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے، حضور اکرم ﷺ کی احادیث کو پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، جس میں بار بار درود شریف پڑھا جاتا ہے۔ جہاں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہو، اللہ تعالیٰ کا بار بار نام لیا جاتا ہو، درود شریف پڑھا جاتا ہو، وہاں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے، وہاں رحمت کے فرشتوں کا بسیرا ہوتا ہے، یہ تو پورے ملک سے وبائی امراض کے دفع کرنے کے مراکز ہیں۔ آپ ان کو بند کرکے گویا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے نزول کو روکنا چاہ رہے ہیں۔

اس کرونا وائرس کی روک تھام کے لیے سعودی عرب اور عرب امارات نے بہت سارے اقدامات کیے، لیکن مساجد کا نمازیوں کے لیے بند کرنا ان کا ایسا اقدام ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔ انہیں کی دیکھا دیکھی ہماری حکومت نے احتیاطی تدابیر کی آڑ میں مساجد میں نمازِ پنج وقتہ اور جمعہ پر پابندی کے اعلانات کرنا شروع کردیئے اور پھر منفی ردِعمل آنے پر کہا کہ نماز مختصر اور جمعہ کے صرف عربی خطبہ پر اکتفاء کریں۔ کیا کسی اسلامی حکومت کے لیے ایسا اعلان کرنا جائز تھا، جبکہ عین حالتِ جنگ میں بھی نماز کی ادائیگی کا حکم ہے۔

کیا مساجد میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے ہم اپنی مساجد بند کرکے باجماعت نماز سے دوری اختیار کرنے کا سبق نہیں دے رہے؟ جن وجوہات کی بنا پر یہ خوف وہراس اور ڈر وخوف کا عذاب مسلمانوں پر نازل ہوا ہے، مسلمان مزید اسی طرف بڑھ رہے ہیں۔ چین کا صدر تو مسجد میں جاجا کر وہاں کے نمازیوں سے اپنے ملک کے لیے دعائیں کرارہا ہے، سڑکوں پر ان کی باجماعت نمازیں ہورہی ہیں، مسلمانوں میں قرآن کریم تقسیم ہورہے ہیں اور ہم مسلمان مساجد بند کررہے ہیں، نعوذ باللّٰہ من ذٰلک۔

آج ہم مسلمان بھی کافروں کی طرح خالص مادی ذہنیت سے اس کرونا وائرس کی روک تھام اور تدارک میں لگے ہوئے ہیں، غیروں کی نقالی اور میڈیا کی بے لگامی نے ماحول میں وہ دہشت اور خوف پھیلادیا ہے کہ الامان والحفیظ۔

پوری دنیا میں آج عالم اسلام دبا ہوا ہے۔ ۵۳/ اسلامی ممالک ہونے کے باوجود آج اسلام

کی پاکیزگیِ نفس، پاکیزگیِ اخلاق اور پاکیزہ روزی کے فوائد وثمرات جیسی اسلامی تعلیمات کے علاوہ آفات وبلیات کے وقت اسلام اور پیغمبر اسلام کی کیا تعلیمات ہیں؟ دنیائے اسلام آج انسانیت کی اس معاملہ میں راہبری وراہنمائی نہیں کررہی ۔ بلکہ لگتا یوں ہے کہ اسلام اور مسلمان ممالک کفار کے دباؤ میں ہیں ۔ دیکھیے ! ایک بستی والے نافرمان بنیں گے تو اللہ کا غصہ ایک بستی والوں پر، ایک شہر والے بنیں گے تو غصہ ایک شہر پر، ایک صوبہ کے لوگ بنیں گے تو اللہ کا عذاب صوبہ پر اور جب کئی ممالک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں شریک ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کا غصہ ان سب پر برپا ہوگا ۔ آج ۱۲۳ ممالک اس کرونا وائرس کی لپیٹ میں آچکے ہیں، یہ اللہ کی پکڑ ہے ۔ ایسے حالات میں تو مساجد کو آباد کرنے کی ضرورت ہے، اللہ کے گھروں کو آباد رکھنے کی ضرورت ہے ۔ جب ہمارا ایمان ہے کہ سب سے مقبولیت کی جگہ اللہ کا گھر ہے اور وہاں بیٹھ کر اللہ سے دعا کی جائے، رویا جائے، گڑگڑایا جائے ۔ اس لیے کہ ہمارا ایمان ہے کہ توبہ واستغفار کیا جائے، اپنے گناہوں کی معافی مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے ۔

آج ہمارے علماء کرام اور دین دار طبقہ میں ایک گناہ بہت زیادہ کیا جارہا ہے اور وہ ہے موبائل کے ذریعہ تصویریں بنانے کا شوق ، اور وہ بھی اللہ کے گھر میں ، مساجد، مدارس اور دینی تقریبات میں ۔ حد تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کعبۃ اللہ کو پیٹھ کر کے لوگ تصویریں بنا رہے ہوتے ہیں ۔ کیا اللہ تعالیٰ کو غصہ نہیں آئے گا؟ اللہ ان کو اپنے گھر سے دفع نہیں کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں آئے گا کہ جاؤ نا! تم اتنے ناپاک ہوگئے ہو کہ ہمارے گھر میں آنے کے قابل نہیں رہے ۔ اور دوسری طرف ہمارے دینی مدارس اور مساجد میں قرآنی تقریبات اور ختم بخاری کی تقریبات بڑے دھوم دھام، فخر ومباہات اور اسراف وتبذیر کے ساتھ ہورہی ہیں، جو بجائے کم ہونے کے اور زیادہ بڑھ رہی ہیں اور انہی دینی تقریبات اور روحانی محافل میں جو اللہ تعالیٰ کے گھر (مساجد) میں جہاں رحمت کے فرشتوں کا بسیرا ہوتا ہے، قرآن کریم اور احادیث موجود ہوتی ہیں، لیکن ہمارے علمائے کرام، طلبہ اور دین دار لوگوں کی دھڑا دھڑ موویاں بن رہی ہوتی ہیں، لائیو پروگرام نشر ہورہے ہوتے ہیں، تصویریں اور فوٹوگرافی ہورہی ہوتی ہے، اور کوئی ان کو روکنے والا نہیں ۔ اس منکر کے خلاف کوئی کھل کر مخالفت نہیں کرتا، تو اب اللہ تعالیٰ کا غضب اور قہر نازل نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

ہمارے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کو چاہیے کہ وہ بیٹھ کر متفقہ طور پر یہ بات طے کریں کہ کم از کم دینی تقریبات، خصوصاً قرآن کریم، ختم بخاری کی تقریبات کو اس گناہِ بے لذت سے پاک رکھیں اور مساجد میں فوٹو اور تصویر کھینچنے اور مووی بنانے کو ناجائز، حرام اور گناہ قرار دیں، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی کم ہوگی اور اس طرح کی وبائیں، امراض، آفات اور مصائب وآلام رک جائیں

گے۔ اگر ہم نے اللہ تعالیٰ کے گھروں کا اکرام نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے گھروں سے ہمیں نکال دیں گے، ولا فعل اللّٰہ ذٰلک ۔قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ.'' (الانفال:۲۵)

''اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہ پڑے گا تم میں سے ظالموں پر چن کر اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔''

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اور بچتے رہو اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے کہ جس کا وبال تم میں سے فقط ان لوگوں پر نہ پڑے گا جنہوں نے خاص کر ظلم کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا وبال عام ہوگا، ظالم اور غیر ظالم سب ہی اس کی زَد میں آجائیں گے۔ آیت میں فتنہ سے مداہنت فی الدین کا فتنہ مراد ہے کہ جب لوگ کھلم کھلا منکرات کا ارتکاب کرنے لگیں اور اہلِ علم باوجود قدرت کے مداہنت برتیں اور نہ ہاتھ اور نہ زبان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں اور نہ دل سے اس سے نفرت کریں جو آخری درجہ ہے اور نہ ایسے لوگوں سے میل جول کو چھوڑیں تو ایسی صورت میں اگر من جانب اللہ کوئی عذاب آیا تو وہ عام ہوگا، جس میں اہلِ معاصی اور مرتکبینِ منکرات کی کوئی تخصیص نہ ہوگی، بلکہ وہ عذاب مداہنت کرنے والوں پر بھی واقع ہوگا، کیونکہ منکرات اور معاصی اگر لوگوں میں شائع ہوجائیں تو ان کی تغییر حسبِ قدرت سب پر واجب ہے اور جو باوجود قدرت کے سکوت کرے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی دل سے راضی ہے اور راضی حکم میں عامل کے ہے، بلکہ بعض اوقات رضا بالمنکر، ارتکاب منکر سے زیادہ دین کے لیے مضر ہوتی ہے، اس لیے اس فتنہ پر جو عقوبت اور مصیبت نازل ہوگی، وہ سب کو عام ہوگی۔''

بہرحال مسلمانوں کو خواہ حکمران ہوں یا رعایا، علمائے کرام ہوں یا عوام الناس سب کو اجتماعی توبہ کرنی چاہیے، اپنی کمی کوتاہیوں کی معافی مانگنی چاہیے اور صدقہ وخیرات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے، ہمارے ملک پاکستان کو اس وباء سے پاک فرمائے، پوری دنیا سے اس وباء کو ختم فرمائے اور ہمارے ملک کو خوش حال بنائے، آمین۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

.....❀.....❀.....❀.....

# نظامِ عالم اور عدل وانصاف

## قوموں اور ملکوں کی تباہی کے اسباب

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ان سات اشخاص کا ذکر آیا ہے جو قیامت کے دن عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوں گے، ان میں سرفہرست امام عادل کا نام آتا ہے:

**’’عن أبي هريرة رضي اللّٰه عنه عن النبي صلی اللّٰه عليه وسلم قال: ’’سبعة يظلهم اللّٰه في ظله يوم لا ظل إلا ظله، إمام عادل ، وشاب نشأ في عبادة اللّٰه ، ورجل معلق قلبهٗ في المساجد، ورجلان تحابا في اللّٰه اجتمعا عليه وتفرقاعليه، ورجل دعته امرأة ذات منصب وجمال فقال: إني أخاف اللّٰه، ورجل تصد ق بصد قةٍ فأخفاها حتی لا تعلم شمالهٗ ما تنفق يمينهٗ، ورجل ذكر اللّٰه خالياً ففاضت عيناه.‘‘**

(صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلوۃ وفضل المساجد، ج:۱،ص:۹۱، ط: قدیمی)

’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے (عرش) کے سائے میں جگہ دے گا جس دن کہ اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ عادل بادشاہ۔ وہ جوان جو اللہ کی عبادت میں پلا بڑھا ہو۔ وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اَٹکا ہوا رہتا ہے۔ ایسے دو آدمی جن کی محبت محض اللہ کی خاطر تھی، اسی کے لیے جمع ہوئے اور اسی پر جدا ہوئے۔ وہ آدمی جس کو کسی صاحبِ حسب وجمال عورت نے دعوت دی تو اس نے کہا: مجھے خدا کا خوف ہے۔ وہ آدمی جس نے اس قدر چھپا کر صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوئی۔ اور وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا تو آنکھیں اُبل پڑیں۔‘‘

عدل درحقیقت اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عظیم الشان صفت ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

’’شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهٗ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ.‘‘ (آل عمران:۱۸)

’’اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، وہی حاکم انصاف کا ہے۔ کسی کی بندگی نہیں سوا اس کے، زبردست ہے حکمت والا۔‘‘

حق تعالیٰ شانہٗ خود عادل ہے، اس کا نازل کردہ قانون (شریعتِ محمدیہ) سراپا عدل ہے، اس لیے بے شمار آیتوں میں بندوں کو عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے اور اس میں ایسی باریکیوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ عقل حیران ہے۔ قرابت کے موقع پر بڑے سے بڑے انصاف پرور کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ جانب داری کی خاطر عدل وانصاف کا دامن چھوڑ دیتا ہے، مگر فرزندانِ اسلام سے ایسی نازک صورت حال میں بھی عدل وانصاف قائم رکھنے کا عہد لیا گیا ہے:

’’يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ إِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى أَنْ تَعْدِلُوْا.‘‘ (النساء:۱۳۵)

’’اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر، گواہی دو اللہ کی طرف کی، اگرچہ نقصان ہو تمہارا، یا ماں باپ کا، یا قرابت والوں کا، اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیرخواہ تم سے زیادہ ہے، سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف کرنے میں۔‘‘

اسی طرح جب کسی سے بغض وعداوت ہو تو عدل وانصاف کے تقاضے عموماً بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں اور اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے آدمی ہر جائز وناجائز حربہ تلاش کرتا ہے، لیکن احکم الحاکمین کی جانب سے مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ ایسے موقع پر بھی عدل وانصاف کی ترازو ہاتھ سے نہ چھوڑیں، بلکہ ہر حال میں عدل وانصاف کو قائم رکھیں:

’’يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ.‘‘ (المائدۃ:۸)

’’اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے، اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔‘‘

## نظامِ عالم اور عدل وانصاف

دراصل کائنات کا نظام ہی عدل وانصاف سے وابستہ ہے، نظامِ عالم کے لیے عدل وانصاف سے بڑھ کر اور کوئی چیز ضروری نہیں۔ بلاشبہ حاکمِ عادل کا وجود اس عالم کے لیے سایۂ رحمتِ الٰہی اور کسی عدل کش حاکم کا تسلُّط عذابِ الٰہی ہے، جو بندوں کی نافرمانیوں کی پاداش میں ان پر نازل کیا جاتا ہے:

شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

کسی زمانے میں مطلق العنان بادشاہ کوس ''لِمَنِ الْمُلْکُ'' بجاتے تھے اور آئین وقانون ان کے اشاروں پر رقص کرتا تھا، لیکن دورِ جدید نے ملوکیت کو جمہوریت میں بدل ڈالا، آئین ودستور وضع کیے گئے، بادشاہت کی جگہ کہیں صدارتی نظام رائج ہوا اور کہیں وزراتی نظام نافذ کیا گیا، گویا دورِ قدیم کے شہنشاہ کا منصب دورِ جدید کے صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم کو تفویض ہوا۔ فرق یہ پڑا کہ دورِ قدیم میں بادشاہ اوپر سے آتے تھے اور دورِ جدید میں نیچے سے جاتے ہیں، لیکن عدل وانصاف محض ملوکیت یا آج کی جمہوریت کا نام نہیں، بلکہ اس کا مدار خدا ترس اور عدل پرور اربابِ اقتدار پر ہے۔ حاکم اعلیٰ عدل وانصاف کے جوہر سے مالا مال ہو تو ملوکیت بھی رحمت ہے، یہ نہ ہو تو جمہوریت بھی چنگیزی کا روپ دھار لیتی ہے، جس طرح مملکت کی آبادی وشادابی عدل وانصاف سے وابستہ ہے، اسی طرح اشخاص کی بقاء وفلاح عدل وانصاف کی رہینِ منت ہے۔

## قوموں اور ملکوں کی تباہی کے اسباب

کسی مملکت کی تباہی وبربادی کے عوامل کا جائزہ لیجئے تو دو بنیادی چیزیں سامنے آئیں گی، قوم کا فسق وفجور اور حکمرانوں کا ظلم وعدوان، جب کوئی قوم خدا فراموشی کی روش اختیار کرتی ہے، الٰہی قوانین سے سرکشی کرتی ہے اور فسق ومعصیت کے نشہ میں بدمست ہوکر حلال وحرام اور جائز وناجائز کے حدود علانیہ توڑنے لگتی ہے تو ان پر جفا کیش اور جابر وظالم حاکم مسلَّط کردیئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں کسی قوم کی تباہی وبربادی کے بارے میں ایک قانون عام بیان فرمایا ہے:

''وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِکَ قَرْیَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا فِیْهَا فَحَقَّ عَلَیْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِیْرًا۔'' (بنی اسرائیل:۱۶)

''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر جب وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں، تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے، پھر اس بستی کو تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں۔''

قوم کا فسق و فجور اور ملوک وسلاطین کا ظلم ہی سب سے پہلے اس عالم کی تباہی و بربادی کا ذریعہ بنتا ہے۔ظلم واستبداد کی چکی میں پہلے سرکش قوم پستی ہے، بالآخر یہی چکی ظالم و جابر کو بھی پیس ڈالتی ہے۔ اہلِ دانش کا قول ہے کہ: ''کفر کے ساتھ حکومت رہ سکتی ہے، مگر ظلم واستبداد کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

درحقیقت کائنات کا حقیقی تصرف واقتدار اللہ رب العالمین اور احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہے۔حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو چندے مہلت دیتا ہے، لیکن جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے نہیں چھوڑتا۔یہی وجہ ہے کہ ظالم حکمران زیادہ دیر تک مسندِ اقتدار پر نہیں رہ سکتا، بلکہ دوسروں کے لیے درسِ عبرت بن کر بہت جلد رخصت ہوجاتا ہے۔تاریک دور کے فرعون وہامان اور شداد ونمرود کو جانے دو، ماضی قریب میں اسٹالن، ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کا عبرت ناک حشر کس نے نہیں دیکھا اور برطانیہ کا حشر بھی سب کے سامنے ہے۔وہ ظالم جس کی بادشاہی میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، آج سمٹ سمٹا کر ایک چھوٹے سے جزیرے میں پناہ گزین ہے۔خود ہماری مملکتِ خداداد پاکستان کی چھوٹی سی عمر میں جابر حکمرانوں کی بے بسی کے عبرت ناک مظاہر سامنے آتے رہے ہیں، کیا سکندر مرزا، غلام محمد، ایوب خاں اور یحییٰ خاں کے قصوں کو دنیا بھول جائے گی۔

## حکومت کی بقاء کے لیے عدل وانصاف ضروری ہے

بہرحال بقائے مملکت اور بقائے حکومت کے لیے بے حد ضروری ہے کہ اربابِ اقتدار عدل وانصاف کو قائم کریں اور قوم فسق ومعصیت کا راستہ ترک کرکے انابت اور رجوع الی اللہ کا راستہ اختیار کرے۔دنیا کی تاریخ بالعموم اور اسلامی تاریخ بالخصوص اس حقیقت پر شاہد ہے کہ مسلمان قوم کو من حیث القوم ناؤنوش، فسق وفجور اور فحاشی وبدکاری کبھی راس نہیں آئی اور اس کا انجام ہمیشہ ہولناک ہوا۔پاکستان کی پاک سرزمین جو حق تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی اس کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں عدل وانصاف کا دور دورہ ہوتا، پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا، تقویٰ وطہارت کی فضا قائم ہوتی، راعی اور رعایا اسلام کا سچا نمونہ پیش کرتے اور یہ مملکتِ خداداد دورِ جدید میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی علمبردار ہوتی، لیکن افسوس صد افسوس کہ:

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

یہاں نہ صرف یہ کہ دورِ غلامی کے تمام آثارِ کفر کو جوں کا توں باقی رہنے دیا گیا، بلکہ آزادی کے بعد یہ فرض کرلیا گیا کہ ہم خدا اور رسول سے بھی آزاد ہیں۔سود، قمار اور دیگر صریح محرمات کو حلال کرنے کی کوشش کی گئی۔فواحش ومنکرات کی ترویج کی گئی۔سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن کو بے حیائی کا مناد بنا

دیا گیا۔ رہی سہی کسر اخبارات نے پوری کردی۔ شعائرِ دین کا مذاق اُڑایا گیا، اسلامی قوانین کو مسخ کیا گیا، دین کے قزاقوں کو کھل کر کھیلنے کا موقع دیا گیا۔ بے خدا قوموں کی تقلید میں آزادیِ نسواں کا پرچار کیا گیا۔ اسلام کے مقابلہ میں نئے نئے ازموں کے نعرے لگائے گئے اور اب تو خدافراموشی کی حالت ایسی ناگفتہ بہ صورت اختیار کرچکی کہ اس کے انجام کا تصور کرکے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

یہ ایک فطری اصول ہے کہ جرم انفرادی ہوتو اس کی سزا بھی افراد تک محدود رہتی ہے اور جب قوم کی قوم ہی جرم و بغاوت کا راستہ اختیار کرے تو اس کی سزا بھی عام ہوتی ہے۔ یہ سزا ہمیں ایک بار سقوطِ مشرق کی صورت میں مل چکی اور ابھی یہ زخم مندمل نہیں ہو پایا تھا کہ سزا کی دوسری قسط کے خطرات سر پر منڈلانے لگے۔

## مسلمان قوم سے اسلام کی روح نکلنے کا نتیجہ

جس طرح روح نکل جانے کے بعد لاشۂ بے جان اپنے وجود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا، بلکہ اس کے اعضاء میں انحلال وانفصال کا عمل شروع ہوجاتا ہے اور بالآخر سڑگل کر منتشر ہوجاتا ہے۔ٹھیک اسی طرح مسلمان قوم سے اسلام کی روح نکل جائے تو نتیجہ انحلال وانتشار کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ شدید خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ جس طرح امریکہ، روس اور ہندوستان کی سازش سے ہم اپنے ملک کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہوبیٹھے ہیں، اسی طرح خاکم بدہن مزید تباہی وبربادی سے دوچار نہ ہوجائیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عقلوں پر کیسے پردے آجاتے ہیں اور ان حقائق سے کیوں عبرت نہیں لی جاتی؟! ایک طرف پورا ملک بے چینی وبے قراری کا شکار ہے، بیم ویاس کی کیفیت طاری ہے، ہوشربا گرانی سے کمر ٹوٹ رہی ہے، خیروبرکت اُٹھ چکی ہے۔ یہی خطۂ زمین جو دوسرے علاقوں کو غلہ فراہم کرتا تھا خود دانے دانے کے لیے دریوزہ گر ہے۔ ہر چیز کا قحط ہے، باہمی اُلفت ومحبت اور اتحاد واعتماد نصیبِ دشمناں ہے۔ رشوت، لالچ، چور بازاری، سٹہ بازی جیسے امراض دَق کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ چوری اور ڈاکے کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن چکی ہیں۔ کیا یہ سب عذابِ الٰہی کی شکلیں نہیں؟ صد حیف کہ ان تنبیہات سے سبق نہیں لیا جاتا، بلکہ فواحش ومنکرات میں روزافزوں اضافہ ہورہا ہے۔کلبوں اور ناچ گھروں میں عریانی بے حیائی کے دردناک مظاہر ہیں۔ظلم وبربریت کی آخری حدوں کو چھویا جارہا ہے۔غفلت وخدافراموشی کا نشہ دن بدن تیز سے تیز تر ہوتا جارہا ہے۔ آخرحق تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی زندگی کب تک برداشت کی جائے گی؟ اور انتقامِ الٰہی کی بے آواز لاٹھی کب تک تھمی رہے گی؟ گزشتہ بے خدا قوموں کے بارے میں فرمایا ہے:

’’الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَأَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ.‘‘ (الفجر:۱۱تا۱۴)

’’یہ سب وہ تھے جنہوں نے زمین میں سرکشی کی، پس اس میں بہت اودھم مچایا، پھر برسایا ان پر تیرے رب نے کوڑا عذاب کا، بلاشبہ تیرا رب گھات میں ہے۔‘‘

ان تمام دردناک صورت حال سے نجات حاصل کرنے کے لیے ازبس ضروری ہے کہ راعی اور رعایا بارگاہِ ربوبیت میں توبہ وانابت اختیار کریں، اجتماعی معاصی سے یکسر پرہیز کریں اور گزشتہ گناہوں پر بارگاہِ رحمت میں توبہ واستغفار کریں، اسلامی شعائر کو بلند کریں اور غیر اسلامی نشانات کو پامال کریں۔ سورۂ نوح میں اس قسم کے معاصی کی کثرت سے قحط وتنگ سالی جیسے عذاب کا نازل ہونا اور اس کا علاج توبہ واستغفار بتایا گیا ہے:

’’فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ إِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهٰرًا.‘‘ (نوح:۱۰تا۱۲)

’’(نوح علیہ السلام بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں قوم سے خطاب کرتے ہوئے) میں نے کہا: گناہ بخشواؤ اپنے رب سے، بے شک وہ ہے بخشنے والا، چھوڑ دے گا تم پر آسمان کی دھاریں اور بڑھادے گا تم کو مال اور بیٹوں سے اور بنادے گا تمہارے واسطے باغ اور بنادے گا تمہارے لیے نہریں۔‘‘

مقصد یہ کہ توبہ وانابت کی برکت سے نہ صرف آخرت کی کامیابی وکامرانی نصیب ہوگی، بلکہ دنیا کے عیش وآرام کی صورتیں بھی اللہ تعالیٰ اپنے فضل واحسان سے مہیا فرمادیں گے۔ دلوں کو سکون واطمینان نصیب ہوگا، اموال میں خیر وبرکت ہوگی، اولاد صالح اور خدمت گار ہوگی۔ آسمان سے ابرِ رحمت کا نزول ہوگا، پھلوں اور غلوں کی کثرت اور بہتات ہوگی۔ فرصت کے لمحات بہت مختصر ہیں اور فیصلے کی گھڑی سر پر آئی کھڑی ہے، اس لیے ہمیں موجودہ حالات کا صحیح علاج فوراً کرلینا چاہیے، ورنہ ہماری ظاہری اور سطحی تدبیریں سب ناکام ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحمت فرمائے، ہماری قوم کو فسق وفجور اور حکمرانوں کو ظلم وعدوان سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ربنا اغفر لنا ذنوبنا وإسرافنا فی أمرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین.
ربنا ظلمنا انفسنا و إن لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین. وصلی اللّٰہ تعالٰی
علٰی خیر خلقہٖ صفوۃ البریۃ سیدنا محمدٍ و علی آلہٖ وأصحابہٖ وأتباعہٖ إلی یوم الدین .

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ....

# سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب وترتیب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

## حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بخدمتِ گرامی محترمی حضرت مولانا یوسف صاحب زاد مجدکم السامي

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمدللہ! میں بعافیت ہوں، خدا کرے مزاج سامی بعافیت ہوں گے۔ گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔ جناب والا کا ارشاد صحیح ہے کہ خدا کے لیے اگر ذلت یہی ہے تو حرج نہیں۔ مدرسہ کے مفاد کے لیے اگر ذلت بھی برداشت کرنا پڑی تو بھی (بندہ) ان شاء اللہ تعالیٰ آں جناب کا تابع رہے گا۔ دو خط کراچی دربارۂ تقرر مولانا عبدالقدیر صاحب وطباعتِ سند وروئیدادِ جلسہ سالانہ وکوششِ سرمایہ لکھ چکا ہوں، مگر مجھ جیسوں کے جواب کا تو وہاں مَد ہی کوئی نہیں، اس کی توقع ہی فضول ہے، اب تو یہی صورت ہے کہ جو بات بارگاہِ عالی میں عرض کرنا ہو، اس کے لیے درِ دولت پر حاضر ہو، بغیر اس کے چارہ نہیں، رمضان اور شوال کے مشاہروں کی فکر ہے۔ اللہ آسان کردے۔

درجہ ابتدائی کے لیے تجربہ کار حلیم الطبع عالم کی ضرورت ہے۔ مولوی دُرمحمد صاحب حلیم الطبع ذو استعداد تو ہیں، مگر تجربہ اتنا نہیں، تاہم بہت اچھے ہیں، تھوڑے دنوں میں تجربہ بھی ان کو ہو جاوے گا۔ آدمی دین دار مطیع ہیں، بہتوں سے اچھے ہیں، متکبر بھی نہیں، مقرر بھی ہیں، مگر اُن کے اِس درجہ میں تقرر کے بعد مولانا قمر صاحب، مولانا عبدالحبیب صاحب سے کیا کام لیا جاوے گا؟! یہ ایک مشکل مسئلہ ہے۔ مولوی عبدالحبیب صاحب پر تو مجھے اعتماد ہے کہ بغیر تحصیلِ چندہ کے مدرسہ میں جو کام ان سے آپ لینا چاہیں گے وہ (فیمـــا أظـن) انکار نہیں کریں گے۔ مولانا قمر صاحب کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

فارسی، اُردو حساب کی تعلیم کے لیے ایک مدرس کی سخت ضرورت ہے، اس کا انتظام بھی ضروری ہے۔ بندہ جلد حاضری کی کوشش کرے گا، کامیابی کی دعا بھی فرمائیں۔

بندہ عبدالرحمٰن غفرلہٗ

از بہبودی ملک خالد، کیمل پور، رمضان المبارک ۷۱ھ

## حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بخدمتِ گرامی مکرمی محترم حضرت مولانا یوسف صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمدللہ! میں ہر طرح سے بعافیت ہوں، خدا کرے مزاجِ سامی بھی بعافیت ہوں۔ دو تین روز ہوئے ایک عریضہ ارسالِ خدمت کیا ہے، اُمید ہے کہ شرف یاب ہوا ہوگا۔ اخیر عشرہ رمضان المبارک کا یہاں شدید گرمی میں گزرا ہے، اب کچھ بارش ہوئی ہے، گرمی کم ہے۔ یہاں عید منگل کو ہوئی ہے، دوشنبہ کو اَبر تھا، عام طور سے چاند نظر نہیں آیا، باہر کی شہادتوں سے عید ہوئی۔ احقر ان شاء اللہ تعالیٰ ۲۰ شوال سے پہلے حاضر ہوگا، اطمینان فرمائیں۔

میرا خیال ہے کہ جتنی قیام گاہیں سرِدست تیار اور مکمل ہیں، ان ہی کے تناسب سے داخلہ ہو، زیادہ نہ ہو کہ طلبہ اور منتظمین دونوں کو اس میں تکلیف ہوتی ہے۔ گو بعض حضرات زیادہ طلبہ داخل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں، مگر انہیں ہماری مشکلات کا احساس نہیں ہوتا۔

امتحانِ داخلہ میں زبان (اُردو) اور تحریر کا ضرور خیال رکھا جائے کہ بجز اس کے امتحانات اور تفہیم و تفہّم میں دِقت ہوتی ہے۔ مدرسہ ''مظاہرِ علوم سہارن پور'' کی ایک مختصر سی روئیداد میں نے جناب کو دی تھی، اس میں ماہوار خواندگی کے نقشے بھی ہیں، اس کو ملاحظہ فرماویں۔ میرا خیال ہے کہ حضرات مدرسین کے مشورے سے ماہوار خواندگی کی ہر کتاب کے متعلق کوئی مقدار متعین ہوجائے، تاکہ کتب کے ختم کرانے اور یا کتب کے پڑھانے میں دِقت نہ ہو۔ داخلۂ امتحان میں مسامحت مناسب نہیں کہ اس کا نتیجہ بہتر نہیں ہوتا، اچھی طرح جانچ پڑتال ہونا چاہیے۔ اخلاق اور ظاہری صورت کا بھی خیال ضروری ہے کہ صورت خلافِ شرع نہ ہو، فتّان اور شرارت پسند نہ ہو، کسی خاص جماعت سے غُلو نہ رکھتا ہو۔

مولوی معزالدین صاحب کا ایک خط ارسال ہے، دارالعلوم میں ان کے مناسب کچھ کام ہو تو مہتمم صاحب کو اطلاع دے کر ان کو رکھ لیا جائے، ورنہ جواب دیا جائے۔ مجھے اور مولانا عبدالحبیب

صاحب کے لیے ایک مکان کی ضرورت ہے ۲۵، ۳۰ کے کرایہ کا، جس میں صحن اور کم از کم دو کمرے علاوہ دیگر ضروریات کے موجود ہوں۔ جناب والا خیال رکھیں، اگر مل جائیں تو بہتر ہے۔ آپ حضرات کے متروکہ مکانات تو رہائش کے قابل نہیں، ان میں تکلیف ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالقدیر صاحب کے متعلق کوئی فیصلہ قطعی غیر قطعی نہیں ہے، اس لیے داخلہ ایسے ہی طلبہ کا لازمی ہے جن کے اسباق موجودہ اساتذہ پورے کرسکیں، اس سے زیادہ نہیں۔

مولوی دُرِ محمد کا کیا ہوا؟ مولوی قمر، مولوی عبدالحبیب کا کیا ہوا؟ خدا کرے خانگی معاملہ بعافیت نمٹ گیا ہو: ''اللّٰھم إنا نسئلک العفو والعافیة في الدنیا والآخرة.''

دعاء عافیتِ دارین کا طالب ہوں، بندہ بھی دعا گو ہے۔ خادم زادگان کی جانب سے سلام مسنون اور دعا کی درخواست۔ جملہ حضرات کی خدمات میں سلام مسنون۔ قاری صاحب کا کیا ہوا؟!

خادم بندہ عبدالرحمٰن غفرلہٗ

از بہبودی، ملک خالد، کیمل پور، ۳ شوال ۱۳۷۱ھ

## جامعہ کے استاذ مفتی محمد احمد بلتی صاحب کو صدمہ
## (ایصالِ ثواب کی درخواست)

جامعہ کے استاذ مفتی محمد احمد بلتی صاحب کی ہمشیرہ عمرہ کی سعادت حاصل کرکے واپس سکردو بلتستان جاتے ہوئے مؤرخہ ۱۹/ فروری ۲۰۲۰ء کو حادثہ میں زخمی ہوئی تھیں، آپریشن کے بعد زخموں سے کافی حد تک تندرست ہونے کے بعد ۴ مارچ ۲۰۲۰ء کو خالقِ حقیقی سے جاملیں، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ما أعطٰی وکل شيء عندہٗ بأجل مسمّٰی. أللّٰھم اغفرلھا وارحمھا وعافھا واعف عنھا وأکرم نزلھا ووسع مدخلھا. دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، آمین بجاہ النبي الأمي الکریم صلی اللّٰہ علیہ وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین.

بینات کے باتوفیق قارئین اپنی دعاؤں اور ایصالِ ثواب میں مرحومہ کو یاد رکھیں۔

# حضرت علاّمہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ

## ایک بلند پایہ محدّث، مایۂ ناز ادیب اور خداترس مہتمم

(تیسری قسط)

مفتی عبدالرؤف غزنوی
سابق استاذ: دارالعلوم دیوبند، انڈیا
حال استاذ: جامعہ علوم اسلامیہ علاّمہ بنوری ٹاؤن، کراچی

### اخلاص وللّٰہیت میں حضرت بنوریؒ کا منفرد مقام اور مالیات میں احتیاط

حضرت علاّمہ سید محمد یوسف بنوریؒ اخلاص وللّٰہیت کے ایک ممتاز مقام پر فائز تھے، وہ رجوع الی اللہ کو دنیا وآخرت کی کامیابی کا اہم ذریعہ اور تمام مسائل ومشکلات کا بہترین حل سمجھتے تھے۔ سفر وحضر میں نمازِ تہجُّد کے پابند اور زاری وعاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے عادی تھے۔ جب مدرسے کا کوئی بھی مسئلہ یا ضرورت درپیش ہوتی تو آپ صبح وشام اور بالخصوص رات کی آخری تہائی میں جس وقت صحیح حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو مخاطب بنا کر اعلان فرماتا ہے کہ: ''کوئی مجھ سے مانگنے والا ہے؟ تاکہ میں اس کی مانگ پوری کروں۔'' اللہ کی طرف متوجّہ ہوکر صرف اسی ذات سے اس کا حل طلب کرتے۔ آپ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں کسی انسان کی خوشامد کی ضرورت نہیں، جو ضرورت پیش آتی ہے ہم اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرتے ہیں اور وہ خود پوری کردیتا ہے۔

حضرت بنوریؒ کا یہ مقولہ بھی مشہور ومعروف ہے کہ: ''ہمیں دو باتوں پر کامل یقین ہے: پہلی بات یہ کہ مال ودولت کے تمام خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں، اور دوسری یہ کہ انسانوں کے قلوب بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر ہم اخلاص کے ساتھ کام کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قلوب کو خود بخود ہماری طرف متوجّہ کرکے اپنے خزانوں سے ہماری مدد کرے گا۔''

اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ حضرت بنوریؒ کے قائم کردہ مدرسے میں دس طلبہ اور ان کے دو اساتذہ (حضرت علاّمہ بنوریؒ خود اور حضرت مولانا لطف اللہ پشاوریؒ) سے تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ دونوں اساتذہ نے بے سروسامانی کی حالت میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے بغیر

معاوضہ کے پڑھانا شروع فرمایا، اور حضرت علامہ بنوریؒ نے ابتداء ہی سے یہ طے کرلیا تھا کہ اس مدرسہ کے لیے کسی سے مدد کی اپیل نہیں کی جائے گی۔ ہاں! اگر کسی نے ازخود اللہ کی رضا کے لیے مدرسہ کی کسی مدّ میں اعانت کی پیش کش کی تو اس کی اعانت شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی اور اس کی طرف سے متعیّن شدہ مدّ میں خرچ کی جائے گی۔ زکوٰۃ کی مد میں آنے والی امداد کسی حیلے کے ذریعے مدرسین کی تنخواہوں یا مدرسہ کی تعمیرات یا مدرسہ کی کتابوں کی خریداری پر ہرگز خرچ نہیں ہوگی، بلکہ صرف مستحق طلبہ پر صرف کی جائے گی۔ مدرسین کی تنخواہوں، درسی کتابوں کی خریداری اور تعمیری ضرورتوں پر صرف عطیات وتبرُّعاتِ نافلہ خرچ ہوں گے۔

اسی اصول کے تحت حضرت علامہ بنوریؒ مدرسہ کے ابتدائی دور میں جب مدرسہ کی مالی حالت کافی کمزور تھی، ہر مدرس کے ساتھ تقرُّری کے وقت یہ طے فرماتے کہ مدرسہ میں چونکہ فی الحال عطیات کے فنڈ میں کچھ بھی نہیں، اس لیے اگر آپ للّٰہ فی اللہ مشاہرہ کے بغیر پڑھانے کے لیے تیار ہیں تو آپ تشریف لاکر پڑھائیں، پھر اگر اللہ کی طرف سے عطیات کا کوئی انتظام ہوگیا تو ہم ازخود آپ کی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ممکنہ مالی خدمت کریں گے، اور اگر آپ مشاہرہ کے بغیر پڑھانے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ہم آپ کی تقرُّری سے معذرت کرتے ہیں۔

## مروَّجہ حیلۂ تملیک سے حضرت بنوریؒ کا مکمل اجتناب

حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرَّہ العزیز کی احتیاط کا یہ عالَم تھا کہ آپ نے مالیات کے لیے دو الگ الگ فنڈ مقرَّر کردیئے تھے، ایک فنڈ زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے لیے، دوسرا فنڈ عطیات وتبرعاتِ نافلہ کے لیے، اور خزانچی کو یہ ہدایت کی تھی کہ دونوں فنڈ میں سے ہر ایک کو دوسرے سے اس طرح جدا رکھا جائے کہ خلط ہونے کا امکان باقی نہ رہے، اور ہر مدّ میں آنے والی رقم صرف اسی مدّ میں خرچ کی جائے، دوسری مدّ میں ہرگز صرف نہ کی جائے۔

یہ تو حضرت علامہ بنوریؒ کے اصول تھے، دوسری طرف یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ اکثر اصحابِ خیر وثَرْوت حضرات سب سے پہلے زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ جیسے صدقۃ الفطر وغیرہ اپنے اموال میں سے ادا کرتے ہیں، اس کے بعد وہ یہ سوچتے ہیں کہ چونکہ فرض وواجب تو ہم ادا کرچکے ہیں، اس لیے عطیات وتبرعاتِ نافلہ کی مدّ میں خرچ کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں، لہٰذا! اس مدّ میں یا تو وہ بالکل خرچ ہی نہیں کرتے یا اگر کرتے ہیں تو بہت ہی کم مقدار میں۔ چنانچہ دیکھا یہ گیا ہے کہ دینی مدارس کے اندر زکوٰۃ کی مدّ میں رقوم وافر مقدار میں دستیاب ہوجاتی ہیں، تاہم عطیات وتبرُّعات کی مدّ میں

ضرورت کے مطابق رقوم فراہم نہیں ہوتیں، جب کہ دینی مدارس میں جہاں مستحق طلبہ کی ضرورت پر خرچ کرنے کے لیے زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں تعمیرات، مدرسین وملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی، درسی کتابوں کی خریداری اور دیگر ضروریات کے لیے عطیات کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے بعض دینی مدارس کے اربابِ انتظام حضرات، عطیات کی کمی کی وجہ سے حیلۂ تملیک کے ذریعے (جس کی اجازت کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ بعض فقہاء نے دی ہے) زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کی رقوم سے مذکورہ بالا ضرورتیں بھی پوری کر لیتے ہیں اور اکثر اوقات حیلۂ تملیک کے جواز کی شرائط کی پوری پابندی بھی نہیں کرتے جو ایک خطرناک بات ہے۔

حضرت علاّمہ بنوریؒ کے ذوق نے مروّجہ حیلۂ تملیک کو قبول نہیں کیا، چنانچہ مدرسہ کی تاسیس سے لے کر اپنی وفات تک کسی بھی مشکل صورتِ حال میں ایک مرتبہ بھی حیلۂ تملیک کے ذریعے زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کی رقوم کو کسی دوسری مدّ میں خرچ نہیں فرمایا، اور جب آپ کو یہ محسوس ہوتا کہ زکوٰۃ کے فنڈ میں سال بھر کے لیے بقدرِ ضرورت رقوم جمع ہوچکی ہیں تو مزید آنے والی رقوم کو واپس کردیتے، اور دینے والے کے اصرار کے باوجود یہ فرماتے کہ ہمارے مدرسے کی ضرورت فی الحال پوری ہوچکی ہے، آپ یہ رقم کسی ایسے مدرسے کو دے دیں جو فی الحال ضرورت مند ہو۔

احقر کہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں حضرت علاّمہ بنوریؒ کے علاوہ کسی اور شخص کے متعلق جو کسی دینی مدرسے کا ذمہ دار ہو، یہ نہیں سنا ہے کہ انہوں نے اپنے زیرِانتظام مدرسے کے لیے پیش شدہ رقم کو اس وجہ سے واپس کردیا ہو کہ ہمارے مدرسے کی ضرورت فی الحال پوری ہوگئی ہے، لہٰذا یہ رقم کسی اور مدرسے کو دے دی جائے، اس لیے کہ ایسی صورت میں وہ ضرور یہ سوچتے ہوں گے کہ فی الحال اگرچہ ضرورت نہیں، بعد میں تو پڑسکتی ہے، پھر یہ رقم میں کیوں واپس کروں؟ اس سے حضرت بنوریؒ کے اخلاص وتوکل علی اللہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

## مالیات میں حضرت بنوریؒ کی احتیاط کا ایک واقعہ

مالیات وامانتِ مدرسہ کے سلسلہ میں حضرت علاّمہ بنوریؒ کی بے مثال احتیاط کے واقعات بے شمار ہیں، جن میں سے صرف دو واقعات بطورِ نمونہ پیش کیے جارہے ہیں، پہلا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی کہ مدرسہ میں عطیات وتبرُّعات کا فنڈ بالکل خالی تھا، البتہ زکوٰۃ فنڈ میں پچیس ہزار روپیہ جمع ہوگیا تھا، ادھر مدرسین کی تنخواہوں کا وقت آ گیا، تو خزانچی حاجی محمد یعقوب کالیہ صاحب نے حضرت علاّمہ بنوریؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ تنخواہوں کے لیے عطیات فنڈ میں کچھ بھی

نہیں ہے، اگر آپ اجازت دیں تو زکوۃ فنڈ سے قرض لے کر مدرسین کی تنخواہیں ادا کردی جائیں، بعد میں زکوۃ فنڈ میں وہ رقم لوٹا دی جائے گی! آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''ہرگز نہیں! اس قرض کی ادائیگی کا کون ذمہ دار ہوگا؟ موت وزندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر اس حالت میں موت آگئی تو یہ قرض کون ادا کرے گا؟ میں مدرسین کی آسائش کے لیے دوزخ کا ایندھن نہیں بننا چاہتا، مدرسین کو صبر کرنا چاہیے اور دعا کرنی چاہیے کہ ان کے فنڈ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کچھ بھیج دیں، اور جو مدرس صبر نہیں کرسکتا اس کو اختیار ہے کہ مدرسہ چھوڑ کر چلا جائے۔''

## آپ کی حیرت انگیز احتیاط کی دوسری مثال

مالیات وامانات میں حضرت بنوریؒ کی احتیاط کی دوسری مثال یہ ہے کہ آپ اپنے ذاتی خطوط کے لیے کبھی بھی مدرسے کے کاغذ وقلم کو استعمال نہیں فرماتے تھے، بلکہ مدرسے کے دفتر میں اپنے میز کے پاس اپنا ذاتی قلم وکاغذ اس مقصد کے لیے احتیاطاً رکھتے تھے کہ بوقتِ ضرورت اپنے ذاتی خطوط کے لیے اپنا ہی سامانِ خط وکتابت استعمال کیا جائے، مدرسے کی امانات کو استعمال میں نہ لایا جائے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ ہی پر توکل وبھروسہ کرتے ہوئے مشکل گھڑیوں میں کسی انسان کی خوشامد کرنے اور اُس سے امید وابستہ کرنے کے بجائے اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوکر اسی سے مانگنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مشکلات کو حل فرماتے ہوئے اپنے غیب کے خزانوں سے اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ، وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ.'' (الطلاق:۲-۳)

ترجمہ ومفہوم: ''اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کردے گا اور اس کو ایسی جگہ سے روزی عطا کرے گا جہاں سے اُسے گمان بھی نہیں ہوگا۔ اور جو کوئی اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ اس کے لیے کافی ہوگا۔''

## حضرت علّامہ بنوریؒ کے ساتھ امدادِ غیبی کا ایک واقعہ

حضرت علّامہ بنوریؒ کی زندگی اللہ تعالیٰ پر بھروسے اور توکل سے عبارت تھی، وہ ہر مشکل گھڑی میں اللہ کے بندوں کے بجائے خود اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرتے اور اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا اپنے وعدے کے مطابق مشکل سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا۔ اسی سلسلے کے واقعات میں سے بھی صرف ایک

ہی سبق آموز واقعہ نمونے کے طور پر ماہنامہ ’’بینات‘‘ خصوصی نمبر سے آپ کے مخلص اور بے تکلف ساتھی حضرت مولانا لطف اللہ صاحب پشاوریؒ کی زبانی نقل کیا جارہا ہے، جنھوں نے حضرت علامہ بنوریؒ کے ساتھ مل کر ابتداء ہی سے محض اللہ کی رضا کے لیے بے سروسامانی کی حالت میں مدرسے میں پڑھانا شروع کردیا تھا:

’’یہاں درس کو جاری ہوئے جب چار مہینے گزر گئے، تو میں نے مولانا سے کہا کہ میری گزر بسر کھیتی باڑی پر ہے (مدرسہ میں تنخواہ کے لیے نہ رقم آئی، نہ تنخواہ ملی، بس فی سبیل اللہ کام چل رہا تھا اور مولانا مرحوم کہیں سے قرض لے کر اپنا اور اہل وعیال کا گزارہ چلاتے تھے) میری فصل کی کٹائی کے دن ہیں، آپ مجھے ایک ماہ کے لیے گھر جانے کی اجازت دیں، تاکہ فصل سمیٹنے کا کچھ بندوبست کرآؤں، مولانا مرحوم نے ہنس کر فرمایا کہ: میں نے خواب دیکھا ہے کہ مدرسین کے لیے میرے پاس کچھ رقم آئی ہے، ذرا انتظار کرو، تاکہ تمہارے کرائے وغیرہ کا تو بندوبست ہوجائے، میں نے ہنسی میں کہا کہ: بلی کو چھچھڑوں کے خواب آیا کرتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد مولانا مسکراتے ہوئے میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: لومولوی صاحب! چھچھڑے آگئے ہیں۔ کسی صاحب نے (غالبًا حاجی وجیہ الدین مرحوم نے) مدرسہ کو چھ سو روپے چندہ بھیج دیا تھا۔ یہ مدرسین کے فنڈ میں مدرسہ کا پہلا چندہ تھا۔ اس میں سے مجھ کو بھی دوسو روپیہ دے دیا۔ میں چھٹی پر گھر چلا آیا اور چھٹی گزار کر واپس چلا گیا۔ نیوٹاؤن کے قیام کے زمانہ میں ایک سال بڑی تنگی اور عسرت کا گزارا، تاہم سال کے آخر تک مدرسے کی حالت مالی طور پر قدرے اچھی ہوگئی۔‘‘ (بینات، خصوصی نمبر بیاد: ’’محدث العصر حضرت بنوریؒ‘‘، ص: ۴۱-۴۲)

## موجودہ دور میں مدارس کے اربابِ انتظام کے لیے سبق

اس میں تو کوئی شک وشبہ نہیں کہ دینی مدارس دین کی حفاظت کے قلعے ہیں، اور ظاہری اسباب کے تحت دینی شعائر کی بقاء وفروغ کے لیے ان کا وجود ناگزیر ہے، لہٰذا! ہر مسلمان کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ دینی مدارس کے اربابِ انتظام اور ان کے معاونین حضرات نہایت اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ تاہم اس میں بھی کوئی تردُّد نہیں کہ ہر دینی کام اسی وقت کامیاب اور باعثِ اجر وثواب بن سکتا ہے جب اس میں اخلاص اور اس کے شرعی آداب کی مکمل رعایت موجود ہو۔

ہمارے اسلاف میں اخلاص، توکل علی اللہ، مشکل حالات میں صرف اللہ کی ذات کی طرف رجوع کرنا اور مخلوق سے مستغنی رہنا، یہ تمام صفات موجود تھیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر مشکل گھڑی میں ان کی مدد فرمائی اور ان کی کوششوں کو کامیاب بنایا۔ انار کے درخت کے نیچے بے سروسامانی کی حالت

میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سرکردگی میں ایک استاذ اور ایک شاگرد سے شروع ہونے والا ایک چھوٹا سا ادارہ جو بعد میں دنیا کا سب سے عظیم اور بابرکت غیر سرکاری دینی ادارہ ''جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے متعارف ہوا، اور حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی سرپرستی میں دو اساتذہ اور دس طلبہ سے (جن کے لیے نہ کوئی مستقل درسگاہ تھی اور نہ ہی رہائش و دیگر ضروریات کا مستقل انتظام) شروع ہونے والا ایک اور مختصر دینی ادارہ جو چند ہی سال بعد دوسرا بڑا غیر سرکاری دینی ادارہ ''جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی'' کے نام سے اُبھرا، اللہ کی مدد کی زندہ ایسی مثالیں ہیں جن سے موجودہ دور میں مدارس کے اربابِ انتظام حضرات سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

دینی مدارس کے موجودہ اربابِ انتظام حضرات بھی دینی مدارس کی خدمت کرتے ہوئے پوری اُمت کی طرف سے ما شاء اللہ بہت ہی اہم فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض منتظمین حضرات تو اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یکسوئی اور اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ دین کی خدمت کر رہے ہیں، البتہ بعض دیگر منتظمین حضرات ایسے بھی ہیں جن کی مندرجہ ذیل سرگرمیوں کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے توکل اور رجوع الی اللہ میں کچھ کمزوری واقع ہوئی ہے، وہ ظاہری اسباب و وسائل کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے اپنے اسلاف کے طریقوں کو یا تو بھول چکے ہیں، یا ان پر اعتماد کھو چکے ہیں۔ نیچے ان کی قابلِ اصلاح سرگرمیاں درج کی جا رہی ہیں:

۱:- مالدار طبقے سے تعلّقات بڑھانا اور ان کی غیر ضروری بلکہ بے جا خوشامد کرنا، جس سے اہلِ علم کا مقام عامۃ الناس کی نظروں میں گرنے لگتا ہے، اور پھر ان کی نصیحتوں اور دینی باتوں پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

۲:- اپنے رہنے سہنے میں سادگی کے بجائے پُرتکلّف زندگی کو ترجیح دینا، جب کہ انبیاء علیہم السلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ہمارے اسلاف رحمۃ اللہ علیہم نے ہمیشہ سادگی کو پسند فرمایا ہے۔ لہٰذا موجودہ زمانے کے اہلِ علم اور اربابِ انتظام حضرات کو بھی پُرتکلّف زندگی کے بجائے سادگی زیب دیتی ہے۔

۳:- اپنے اپنے مدارس کی تشہیر کے لیے ضرورت سے زیادہ اقدامات کرنا اور ان پر پیسے خرچ کرنا، اور نیٹ و دیگر ذرائع استعمال کرنا جو ایک نامناسب اور توکل علی اللہ کے برخلاف عمل ہے۔

۴:- حفظِ قرآن پاک، ختم بخاری شریف اور دستار بندی کے عنوان سے بڑے بڑے اجتماعات منعقد کرنا، شرکت کے لیے دور دور سے لوگوں کو بلانا، ان اجتماعات کی تشہیر وانتظام پر اچھے خاصے پیسے خرچ کرنا اور پھر اختیاری یا غیر اختیاری طور پر ان میں تصویر کشی جیسے ناجائز عمل کا شامل ہو جانا، جس سے عامۃ الناس اس بنیاد پر تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ایک جانب سے تو تصویر کشی کی

حرمت کا فتویٰ دیا جاتا ہے اور دوسری طرف علماء ہی کے اجتماعات میں وہ شامل ہو جاتی ہے!۔

۵:-تعلیم کی ترقی اور طلبہ کی تربیت ونگرانی پر توجہ دینے کے بجائے غیرضروری اسفار اور اپنے متعلقین سے ملاقاتوں کو اہمیت دینا جو تعلیمی وتربیتی نظام کے لیے بے حد مضرّ ہے۔

مذکورہ بالا سرگرمیوں کو انجام دینے والے منتظمین حضرات کی نظروں میں کچھ دینی مصلحتیں ضرور ہوں گی، جن کے تحت وہ ان سرگرمیوں کو اختیار کرتے ہیں۔ مجھے کسی کی نیت پر شبہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا، اور بالخصوص اہلِ علم حضرات کی نیتوں پر مجھ جیسے گوشہ نشین، موجودہ حالات کے تقاضوں سے ناواقف اور ایک ادنیٰ طالب علم کو تو ہرگز شک کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ تاہم! اپنے اسلاف واکابرین کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کے سامنے اتنی بات تو بالکل عیاں ہے کہ بانیِ ''دارالعلوم دیوبند'' حُجّۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ سے لے کر بانیِ ''جامعہ علوم اسلامیہ کراچی'' محدث العصر حضرت علاّمہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ تک دینی مدارس کے اربابِ انتظام واہلِ علم حضرات نے جو خدماتِ جلیلہ انجام دی ہیں اور کامیابیوں نے ان کے قدم چومے ہیں، انہوں نے مذکورہ بالا یا ان سے ملتی جلتی دیگر سرگرمیوں کو نہ تو خود اپنایا تھا اور نہ ہی انہیں پسند فرمایا تھا۔

## جامعہ علوم اسلامیہ علاّمہ بنوری ٹاؤن ایک نظر میں

اس سے پہلے یہ واضح ہو چکا ہے کہ اس مدرسے کو محدّث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ نے بے سروسامانی کی حالت میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے ماہِ محرم ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۴ء میں ''مدرسہ عربیہ اسلامیہ'' کے نام سے قائم فرمایا۔ ابتداء میں یہ مدرسہ عبارت تھا' ٹین کی چھت والے ایک کمرے، دس طلبہ اور ان کے دو اساتذہ سے، جن میں سے ایک خود ہی حضرت علاّمہ بنوریؒ تھے۔ اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اور حضرت علاّمہ بنوریؒ کے اخلاص وتقویٰ، توکل علی اللہ ومسلسل محنت، اور امانت داری وشب خیز دعاؤں کی برکت سے ترقی کرتے ہوئے ''دارالعلوم دیوبند'' کے بعد پورے برّصغیر کے سب سے بڑے دینی اداروں میں اس کا شمار ہونے لگا، اور دنیا کے کونے کونے سے تشنگانِ علوم نبوت اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے اس کا رخ کرنے لگے، اور بجا طور پر ''مدرسہ عربیہ اسلامیہ'' کے بجائے ''جامعہ علوم اسلامیہ علاّمہ بنوری ٹاؤن کراچی'' کے نام سے موسوم ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ''جامعہ علوم اسلامیہ علاّمہ بنوری ٹاؤن کراچی'' نے بتدریج اتنی ترقی کی ہے کہ اس وقت وہ ایک مرکز اور گیارہ شاخوں پر مشتمل ایک عظیم الشان ادارہ بن چکا ہے۔ اس ادارے میں اس کے مرکزی دفتر کی رپورٹ کے مطابق سال رواں ۱۴۴۱ھ کے اندر مدرسین ومعلمات

کی مجموعی تعداد چار سو آٹھ، ملازمین کی تعداد دو سو پینتالیس اور طلبہ وطالبات کی مجموعی تعداد بارہ ہزار سات سو چھبیس ہے۔ یہ ادارہ اپنے طلبہ کے لیے رہائش، درسگاہیں، درسی کتابیں، ماہانہ وظائف، کھانا پینا اور علاج معالجہ بالکل مفت میں فراہم کرتا ہے۔ اور اپنے مدرسین وملازمین کے لیے گنجائش کے مطابق رہائش مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ماہانہ مناسب تنخواہیں بھی پیش کرتا ہے۔

ادارہ نہ تو حکومت سے کوئی امداد لیتا ہے اور نہ ہی اس کے پاس آمدنی کا کوئی متعین ذریعہ یا چندہ جمع کرنے والا کوئی سفیر موجود ہے! بلکہ بانیِ جامعہ حضرت علامہ بنوریؒ کی للّٰہیت واخلاص، سنتوں کی پیروی اور توکل علی اللہ کا یہ کرشمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی محسنین کے دل میں امداد کرنے کا جذبہ پیدا کردیتا ہے اور وہ آکر حسبِ توفیق اس عظیم الشان دینی ادارے کی مالی خدمت کرتے ہوئے ثوابِ دارَین حاصل کرتے ہیں، علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے:

ماسوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح وقلم تیرے ہیں

## حضرت علامہ بنوریؒ کی تصانیف ومقالات

محدّث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کو اللہ تعالیٰ نے تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اعلیٰ صلاحیت سے نوازا تھا۔ احقر جب ان کی تصانیف بالخصوص ''معارف السنن شرح سنن الترمذي'' پرغور کرتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اگر ان کو یکسوئی وتسلسل کے ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں کام کرنے کا موقع ملتا تو شاید ایسے تحقیقی وتالیفی کام کرچکے ہوتے کہ دنیا حیران رہ جاتی اور بعض مشہور متقدمین پر بھی سبقت لے جاتے، لیکن تقدیرِ خداوندی سے آپ کی زندگی میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے رہے کہ کسی ایک ہی جگہ جم کر یکسوئی کے ساتھ تحقیق وتصنیف کے کام میں مسلسل لگنے کا موقع میسر نہ رہا۔

پہلے لکھا جاچکا ہے کہ فراغت کے بعد آپ چند سال پشاور میں مصروفِ عمل رہے، پھر ''جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل'' میں شیخ الحدیث ومجلسِ علمی کے رکن کی حیثیت سے تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتحقیق کے کام سے وابستہ ہوگئے۔ اس دوران انہوں نے ''نفحة العنبر''، ''يتيمة البيان'' اور ''بغية الأريب'' لکھنے کے ساتھ ساتھ ''العَرْف الشذي شرح سنن الترمذي'' پر بھی شروع سے

’’أبواب الحج ‘‘ کے وسط تک بے مثل تحقیقی کام کیا، آخرالذکر تحقیقی کام اگر پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا تو ایک بے نظیر علمی سرمایہ ہوتا، لیکن ایسا اس لیے نہ ہوسکا کہ اس درمیان میں ملک تقسیم ہوگیا اور حضرت علاّمہ بنوریؒ کو بھی پاکستان ہجرت کرنی پڑی۔ پاکستان آنے کے بعد تین سال کا عرصہ ’’دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالٰہ یار‘‘ کے اندر کچھ ایسی حالت میں بیت گیا کہ آپ وہاں کے ماحول سے مطمئن نہ ہوسکے۔ پھر وہاں سے کراچی تشریف لاکر یہاں اُن پر بے سروسامانی کی حالت میں ایک نئے مدرسے کی تاسیس واہتمام اور تدریس کی ذمہ داری عائد ہونے کے ساتھ ساتھ قادیانیت ودیگر فتنوں کے تعاقب کی ذمہ داری بھی عائد ہوگئی، جس کی وجہ سے تحقیق وتصنیف کے لیے درکار یکسوئی کا موقع میسر نہ ہوسکا۔

تحقیق وتصنیف کے میدان میں ان کی بے مثال صلاحیت کے باوجود، مکمل اور مسلسل یکسوئی نہ ملنے کی دو اہم وجوہات سمجھ میں آتی ہیں (واللہ اعلم بالصواب): پہلی وجہ یہ ہے کہ حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ اخلاص وللّٰہیت پر مبنی ’’جامعہ علوم اسلامیہ علاّمہ بنوری ٹاؤن‘‘ کی شکل میں ایک ایسا ادارہ حضرت بنوریؒ کے ذریعے وجود میں آئے جس کے انوار وبرکات سے صرف پاکستان کے مسلمان نہیں، روئے زمین کے مختلف حصوں میں بسنے والے دیگر مسلمان بھی تسلسل کے ساتھ مستفید ہوتے رہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف سر اُٹھانے والے فتنوں بالخصوص قادیانیت کے خلاف علاّمہ بنوریؒ کے توسُّط سے ایک مؤثر انداز میں ایسا تعاقب ہو جس کے بعد وہ سر نہ اُٹھا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں ایسے بڑے کام حضرت بنوریؒ سے لیے جن کی اہمیت کا اندازہ ایک حد تک تو درد ِدل رکھنے والا ہر انسان لگا سکتا ہے، تاہم! ان دونوں کارناموں کی وجہ سے ان کے محبوب استاذ ومُربی محدّث العصر حضرت علاّمہ سید محمد انورشاہ کشمیری قدس سرہٗ کی روح کو کتنا سکون ملا ہوگا؟ اور اللہ تعالیٰ ان قربانیوں کے عوض استاذِ محترم حضرت علاّمہ کشمیریؒ اور ان کے تربیت یافتہ شاگرد حضرت علاّمہ بنوریؒ کو قیامت کے دن کیا کیا مقام عطا فرماتا ہے؟ اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوگا۔

بہرصورت! حضرت علاّمہ سید محمد یوسف بنوریؒ مختلف عوارض اور تدریسی وانتظامی مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف کے لیے جو وقت میسر ہوتا نکالتے رہے اور عربی زبان میں لکھنے کو اس کی اہمیت وفضیلت کے پیشِ نظر ترجیح دیتے رہے، اگرچہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں بھی آپ کو مہارت حاصل تھی۔ آپ کی عربی تصانیف یہ ہیں:

۱...... ’’**معارف السنن شرح سنن الترمذي** ‘‘ (شروع سے ’’**أبواب الحج** ‘‘ کے اختتام تک چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل نہایت اہم کتاب)

۲...... ’’**نفحة العنبر في حياة إمام العصر الشيخ محمد أنور** ‘‘ (حضرت شاہ صاحبؒ

کی سوانح پر مشتمل ۷۳۳ صفحات کی کتاب)

۳..... ''یتیمة البیان في شيئ من علوم القرآن'' (۱۷۴ صفحات پر مشتمل مشکلات القرآن کا مقدمہ)

۴..... ''بغیة الأریب في مسائل القبلة والمحاریب'' (۱۷۳ صفحات پر مشتمل ایک تحقیقی رسالہ)

۵..... ''القصائد البنوریة'' (۲۲۸ صفحات پر مشتمل آپ کے عربی قصیدوں کا مجموعہ)

۶..... ''الأستاذ المودودي وشيئ من حیاته وأفکاره'' (تقریباً پچاس پچاس صفحات کے دو اجزاء پر مشتمل ایک تحقیقی وعلمی رسالہ)

۷..... ''المقدمات البنوریة'' (مختلف کتابوں پر آپ کے علمی مقدمات کا مجموعہ جو ۳۶۱ صفحات پر مشتمل ہے)

ان کے علاوہ آپ اپنی زندگی میں اردو ماہنامہ ''بینات'' کے لیے ''بصائر وعبر'' کے عنوان سے حالاتِ حاضرہ پر مسلسل اداریہ بھی لکھتے رہے، ان تمام مضامین کو ترتیب دے کر دو ضخیم جلدوں میں آپ کے وصال کے بعد شائع کیا گیا، جن میں سے پہلی جلد سات سو صفحات پر اور دوسری جلد سات سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ''بصائر وعبر'' کا مذکورہ مجموعہ ایک بیش بہا علمی خزانہ ہے۔

## معارف السنن کی اشاعت اور اللہ کی غیبی مدد

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ مختلف عوارض کی بنیاد پر ''العَرْف الشذي شرح سنن الترمذي'' پر جو حضرت علامہ بنوریؒ نے تحقیقی کام شروع فرمایا تھا، وہ ''أبواب الحج'' کے وسط تک پہنچ کر رُک گیا تھا، بالآخر بعض مخلصین کے اصرار پر آپ نے ''أبواب الحج'' کے بقیہ ابواب کی تشریح بھی کردی اور شروع سے ''أبواب الحج'' کے آخر تک جو کام ہو چکا تھا، ''معارف السنن شرح سنن الترمذي'' کے نام سے چھ جلدوں میں اسے شائع فرمادیا۔ اس اشاعت کے سلسلے میں جو اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد شامل رہی، اس کا تذکرہ حضرت علامہ بنوریؒ نے خود ہی ''معارف السنن'' کے آخر میں فرمایا ہے، جس کا مفہوم وترجمہ راقم الحروف کی طرف سے درج کیا جارہا ہے:

''معارف السنن'' کی اشاعت سے متعلق اللہ تعالیٰ کے غیبی انتظام کا یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ سب سے پہلے ''معارف السنن'' کا وہ حصہ جو مباحثِ وتر سے متعلق ہے ایک رسالہ کی شکل میں ''جزء الوتر'' کے نام سے شائع ہوکر علماء حرمین شریفین تک پہنچا، تو انہوں نے بے حد پسند فرمایا، اور میرے نہایت

ہی مخلص و گہرے دوست، جلیل القدر و متقی عالم شیخ حسن محمد مشاط مالکی نے ''جزء الوتر'' سے متأثر ہوکر اصرار فرمایا کہ: اس کتاب کے جتنے اجزاء لکھے جاچکے ہیں، یہ پورے آپ ضرور شائع کیجئے۔ میں نے یہ عذر پیش کیا کہ ایک طرف تو حالات بدل چکے ہیں اور وہ علمی ذوق لوگوں میں اب نہیں رہا جو پہلے تھا، لہٰذا ایسی ضخیم تالیفات کی ان حالات میں ضرورت باقی نہیں رہی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس پوری کتاب کی اشاعت کے لیے تو کافی مال کی ضرورت ہے، جو کہ میرے پاس نہیں، اور نہ یہ میری عادت ہے کہ ایسے مسائل مال داروں کے سامنے پیش کیا کروں۔

میری اس معذرت کے باوجود شیخ موصوف کے اصرار میں اضافہ ہوا، اور فرمایا کہ: آپ کتاب کی اشاعت کی طرف توجہ فرمائیں اور یاد رکھئے کہ تجربہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ تین کام ایسے ہیں کہ اگر آدمی ان کے لیے ہمہ تن متوجہ ہوکر بجالانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسباب مہیا فرماتا ہے اور تینوں کام مکمل کراہی دیتا ہے: ایک نکاح، دوسرا حج اور تیسرا کتاب کی اشاعت۔

ہماری یہ گفتگو مسجد حرام میں ہورہی تھی، شیخ کے اصرار کو دیکھ کر میں فکرمند ہوا اور مجلس کے اختتام پر سیدھے بیت اللہ کی طرف آکر اسی مقصد کے لیے طواف کیا، اور ملتزم کے پاس کعبۃ اللہ کا غلاف پکڑ کر والہانہ انداز میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی: اے اللہ! اگر موجودہ حالات میں اس کتاب کی اشاعت میں دین وعلم کا کوئی فائدہ مضمر ہے، اور اُمت کے لیے اس میں کوئی نفع کا پہلو ہے تو آپ ہی اس کی اشاعت پر قادر ہیں، میرے پاس قدرت نہیں اور آپ ہی عالم الغیب ہیں، اس کی مصلحت کو جانتے ہیں، میرے پاس انجام ومصلحت کا علم نہیں، کچھ ایسے ہی کلمات کے ساتھ میں نے دعا کی اور اپنے ملک واپس چلا آیا۔

میری واپسی کے بعد ہی میاں برادری سے تعلُّق رکھنے والے جنوبی افریقا کے میرے ایک مخلص وصالح دوست کا پیغام موصول ہوا کہ آپ یہ کتاب جو آپ نے لکھی ہے ضرور شائع کردیں۔ میں نے ان کے سامنے بھی وہی عذر پیش کیا جو حضرت شیخ مشاط کے سامنے پیش کرچکا تھا تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ: طباعت کی پوری ذمہ داری میری ہے، لیکن کتاب ہرصورت میں چھپنی چاہیے۔ پھر تقریباً ایک سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد مجھے لکھا کہ اصل بات یہ تھی کہ میں نے حضرت امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو ایک طویل خواب میں دیکھا تھا، جس میں یہ بھی دیکھا تھا کہ میں حضرت امام العصرؒ سے مشورہ لے رہا ہوں کہ علمِ حدیث میں کس کتاب کی اشاعت اُمت کے لیے مفید رہے گی؟ حضرت مشورہ دے رہے ہیں کہ: بنوری نے جو لکھا ہے اسی کو شائع کردیا جائے۔

یہ خواب اُن ہی دنوں میں دیکھا گیا تھا جب میں نے ملتزم کے پاس اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی،

تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو اس طرح آمادہ کر کے کتاب کی اشاعت کا انتظام فرمایا۔‘‘ (معارف السنن، ج:۶،ص:۴۳۹-۴۴۰)

اللہ اکبر! اندازہ کیجئے اخلاص وتقویٰ اور رجوع الی اللہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کیسے کرشمے ظاہر ہو جاتے ہیں!۔ غلافِ کعبہ کو پکڑے ہوئے ایک مؤمنِ مخلص کی طرف سے مسجد حرام میں ملتزم کے پاس والہانہ انداز میں دعا کی جاتی ہے، اور اُدھر ہزاروں میل دور اسی وقت ایک دوسرے مخلص مسلمان کے قلب کو خواب کی حالت میں الہام ہو جاتا ہے! اور دعا کی قبولیت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقبولیت عطاء فرمائی تھی کہ اگر وہ ادنیٰ اشارہ بھی کسی کو کر دیتے تو اسی وقت طباعت کا انتظام ہو جاتا، لیکن انہوں نے علم کے وقار اور علماء کے مقام کی حفاظت کرتے ہوئے اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے ذکر کرنے کو مناسب نہیں سمجھا، اور اپنے رب کریم ہی سے بہتری کی دعا کی، دیکھئے! پھر ربِ کریم نے کس طریقہ سے انتظام فرمایا! اور کتاب کو کتنی مقبولیت عطا کی!۔

**(جاری ہے)**

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ....

# کرونا وائرس اور نبوی تعلیمات!

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
اُستاذ ونگران شعبہ تخصص فقہ اسلامی جامعہ

''کرونا وائرس'' ایک ڈراؤنی وباء بن کر دنیائے انسانیت کا رُخ کیے ہوئے ہے۔ کئی ممالک میں وبائی مرض کی تشخیص بھی ہوچکی ہے اور متعدد انسانی جانوں کے ضیاع کی اطلاعات بھی ہیں، جبکہ کثیر تعداد کے متأثر ہونے کی خبریں بھی عام ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، اٹلی، چائنہ اور کوریا کی طرح سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، ایران اور پاکستان میں بھی اس وبائی مرض کے خطرات وخدشات بڑی شدّت سے محسوس کیے جارہے ہیں اور اس کے لیے احتیاطی تدابیر اور حفاظتی احکامات بھی مختلف شکلوں میں سامنے آرہے ہیں۔ عوامی آگاہی کے لیے ریاستی ادارے، اطباء اور متعدد علماء کرام بڑی تندہی سے سرگرمِ عمل ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے، آمین!

تاہم یہ بیماری کس قدر خطرناک ہے اور اس کے خطرات سے عوام الناس کس قدر دوچار ہوئے ہیں؟! اس کا صحیح اندازہ تو فی الحال نہیں ہو پارہا، لیکن اس وبائی مرض کی آگاہی کا منظر نامہ انتہائی ڈراؤنا بن کر وباء سے پہلے ہی خود وباء بن کر معاشرے کو ذہنی ونفسیاتی موت مارے جارہا ہے، اس وباء کی آگاہی مہم نے چارسو سراسیمگی پھیلا رکھی ہے، انسانوں کے غیر ضروری اجتماعات کے ساتھ ساتھ ضروری میل جول، بلکہ عبادات اور شعائرِ اسلامیہ سے بھی روکنے کی باتیں ہورہی ہیں۔ آسمانی وباء سے پہلے اس کی آگاہی کو وبائی ہوّا بنانے میں ہمارے بعض دینی دانش وروں کا کردار بھی شامل ہے۔ ہمارے یہ حضرات وبائی امراض کے حوالے سے شرعی احکام وآداب کا یکطرفہ منظر نامہ پیش کرکے ہمارے خوف وہراس میں مزید اضافے کا باعث بن رہے ہیں، ان اہلِ علم کو چاہیے کہ وہ وبائی امراض کے حوالے سے کم از کم شریعتِ اسلامیہ کی پوری بات نقل فرمائیں۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ وبائی امراض، مختلف مصائب اور خطرات سے متعلق شرعی احکام اور نبوی تعلیمات وہدایات تقریباً چار قسم کی ہیں:

۱:-مستقبل کے حالات اور احوال کے بارے میں توکل (اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرنا) ایمانی کمال کی علامت ہے، جنت میں بلاحساب پہلے پہل داخلے کی بشارت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کے باوجود کوئی بلاء، وباء یا مصیبت لاحق ہوجائے تو اس پر صبر کیا جائے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی معیت اور ناقابلِ ضیاع اجر کا وعدہ ہے۔ یہ مضمون حدیث کی کتابوں میں ''**باب التوکل والصبر**'' کے زیرِعنوان متعدد روایات کی صورت میں موجود ہے۔

۲:-تقدیرِ الٰہی پر بندۂ مومن کی راسخ الاعتقادی وہ مفید عقیدہ ہے جو بڑی سے بڑی مصیبت کو خدائی فیصلہ قرار دے کر ذہنی طور پر قبول کرنے، سہہ جانے اور مافات پر بے جا اشکہائے حسرت و یاس بہانے سے محفوظ رکھتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جو چاہت ہے وہ پوری ہوکر رہے گی اور جس امر سے اللہ تعالیٰ کی چاہت متعلق نہ ہو تو وہ کائنات کے سارے اسباب کی یکجائی اور اکٹھ کے باوجود بھی ظہور پذیر یا اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ حدیث کی کتابوں میں ''**باب القدر**'' کے تحت اس مضمون کی تفصیلی حدیثیں موجود ہیں۔

۳:-اگر کوئی بیماری کسی کو واقعی لاحق ہوجائے تو ایسے مریض کی ڈھارس بندھائی جاتی ہے، حوصلہ بڑھایا جاتا ہے، اسے مایوسی نہیں دلائی جاتی۔ مریض کو یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، بیماری گناہوں کی صفائی کے لیے ہوتی ہے۔ مریض اگر مرضِ وفات میں ہو تب بھی اسے خوش گوار زندگی کی اُمید دلانے والی باتیں کرنے کا حکم ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ''**باب عیادۃ المریض**'' کے تحت یہ مضمون واشگاف الفاظ میں موجود ہے۔

۴:-اگر کسی قوم یا علاقے میں کوئی وبائی مرض آجائے تو ایسے علاقے کے باسیوں کے لیے الگ احکام ہیں اور دوسرے علاقوں سے یہاں آنے والوں کے لیے الگ احکام ہیں۔ باہر سے آنے والوں کے لیے حکم ہے کہ وہ از راہِ احتیاط، تحفظِ عقیدہ کی خاطر ایسے علاقے اور قوم کا رُخ نہ کریں، کیونکہ اگر کوئی اتفاقاً ہی سہی تقدیرِ الٰہی کی بنیاد پر ہی اگر وبائی مرض کا شکار ہوجائے تو ایسے موقع پر کوئی ضعیف الاعتقاد مسلمان وبائی مرض کے مؤثرِ حقیقی ہونے کا خیال نہ کر بیٹھیں، حالانکہ تمام اشیاء اور ان کی ہر نوع کی تاثیرات اللہ کے حکم، ارادے اور مشیت کے تابع ہیں، خود تو بے حقیقت ہیں، نظریاتی و فکری مسلمان کی نظر و فکر کہیں مؤثرِ حقیقی یعنی باری تعالیٰ کی بجائے ظاہری سبب کی طرف جاسکتی ہے، اس لیے شریعت نے وبائی امراض کے زیرِ اثر قوموں اور علاقوں کے اختلاط سے منع فرمایا ہے۔

جہاں تک وباء زدہ علاقے کے مقامی لوگوں کے لیے ہدایات کا تعلق ہے، ان ہدایات کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان یہ عقیدہ پختہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی بھی بیماری ایک انسان سے دوسرے انسان کو نہیں لگ سکتی: ''**لاعدویٰ ولاطیرۃ**'' جیسی حدیثوں میں اس کا بیان ملتا ہے، اگر مسلمان راسخ

العقیدہ بن کر اس نظریئے سے چمٹا رہے گا تو یقیناً وہ وبائی مرض کے موہوم مضر اثرات سے محفوظ رہے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے خود جذام میں مبتلا شخص کو اپنے ساتھ بٹھایا اور انہیں اپنے ساتھ کھانا کھلایا تھا۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی موجود ہے کہ مجذوم سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بچنے کے لیے بھاگتے ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی متعدی وبائی بیماری کا حقیقی اثر نہ سہی مگر ظاہری سبب کے درجے میں اثر انداز ہونے کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، بلکہ ایسی وبائی بیماریوں سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا بھی شریعت کے منافی نہیں، بلکہ شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

پس کسی وبائی مرض، اس کے منفی اثرات اور اس سے بچاؤ کی حفاظتی تدبیریں نارمل انداز میں بیان کرنا، بتانا اور ان پر عمل کرنا تعلیماتِ نبوی کا حصہ ہیں، ایسا ضرور ہونا چاہیے۔ جو اہلِ علم اس آگاہی مہم اور احتیاطی تدابیر کے اظہار و بیان میں مناسب کردار ادا کر رہے ہیں ان کا کردار بھی قابلِ قدر ہے، دینی تبلیغ ہے، مگر یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے حضرات وبائی مرض کے ڈراؤنے پہلو کو مزید ڈراؤنا بنانے کے بجائے نبوی تعلیمات تک محدود رہیں اور نبوی تعلیمات میں سے احتیاطی تدابیر کے ساتھ ساتھ قضاء وقدر، تسلی اور دلاسے کے شرعی پہلو کو بھی ضرور بیان فرمائیں۔

جبکہ سرکاری حکام اور ریاستی اداروں کے لیے شرعی حکم اور دینی نصیحت یہ ہے کہ وہ بھی اپنی آگاہی مہم اور احتیاطی تدابیر کو شریعتِ اسلامیہ کے ذکر کردہ احکام وآداب کے تابع رکھیں۔ اس حوالے سے بے جا جبر واکراہ سے گریز کریں، بالخصوص عبادات، دینی شعائر اور کتابِ شفاء (قرآن کریم) کے تعلیمی حلقوں میں ذرا بھر رخنہ اندازی نہ کریں، بلکہ روحانی علاج کے طور پر قرآنی تعلیم کے حلقوں، خانقاہوں اور دینی مدارس کے الٰہی ونبوی زمزموں کا فوری احیاء واہتمام کروائیں، ایسے حلقوں کی بندش کے خاتمے کا فوری اعلان کریں اور ہر جگہ اجتماعی دعاؤں کے لیے احکامات جاری کریں۔

جو اہلِ علم، حکامِ وقت کا قرب یا اُن تک رسائی رکھتے ہیں، ان کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ کرونا وائرس کی بابت سرکاری رویّے، اس موقع پر علماء کے بیانات اور عالم رؤیا کے سیاحوں کے خوابوں کے حوالے سے جس حد درجے کے احتیاط کی ضرورت ہے، وہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''**بذل الماعون في فضل الطاعون**'' میں مذکور ہے، اس کے متعلقہ حصے خود بھی پڑھیں اور ان افادات کی روشنی میں حکام کو بھی نصیحت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو ہر قسم کی وباؤں اور مصیبتوں سے نجات دے اور محفوظ رکھے۔ آمین

......❀......❀......❀......

# قرآن کریم کا تعارف

## (اور ہماری ذمہ داری)

ڈاکٹر مفتی محمد نجیب قاسمی سنبھلی
فاضل دارالعلوم دیوبند، انڈیا

## قرآن کیا ہے؟

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک آنے والے انس وجن کی رہنمائی کے لیے آخری نبی حضور اکرم ﷺ پر وحی کے ذریعہ نازل فرمایا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، مخلوق نہیں۔ قرآن کریم لوحِ محفوظ میں ہمیشہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے ملأ اعلیٰ یعنی آسمانوں کے اوپر تحریر ہیں، وہ کسی بھی تبدیلی سے محفوظ ہونے کے ساتھ شیاطین کے شر سے بھی محفوظ ہیں، اس لیے اس کو لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے۔ اس کی شکل وصورت وحجم کیا ہے؟ ہم نہیں جانتے، مگر قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔

قرآن ''قَرَأَ'' کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: پڑھی جانے والی کتاب۔ واقعی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن کریم ہے، جس کی بغیر سمجھے بھی لاکھوں لوگ ہر وقت تلاوت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہوں پر اپنے پاک کلام کے لیے قرآن کا لفظ استعمال کیا ہے: ''**إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيْمٌ**'' (الواقعہ: ۷۷) ۔ اسی طرح فرمایا: ''**بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ**'' (البروج: ۲۱)

قرآن کریم عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''ہم نے اس کو ایسا قرآن بنا کر اُتارا ہے جو عربی زبان میں ہے، تاکہ تم سمجھ سکو۔'' (یوسف: ۲) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو قیامت تک آنے والے انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے، مگر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہی اس کتاب سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد سورۃ البقرۃ آیت: ۲ اور سورۂ آلِ عمران آیت: ۱۳۸ میں موجود ہے۔

## نزولِ قرآن

حضورِ اکرم ﷺ پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی:

۱:-گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی اور آواز نے جو کچھ کہا ہوتا، وہ حضورِ اکرم ﷺ کو یاد ہو جاتا۔ جب اس طریقہ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا۔

۲:-فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ ﷺ کے پاس آتا اور اللہ تعالیٰ کا پیغام آپ کو پہنچا دیتا۔ ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے۔

۳:-حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصل صورت میں تشریف لاتے تھے۔

۴:-بلاواسطہ اللہ تعالیٰ سے حضورِ اکرم ﷺ کی ہم کلامی ہوئی۔ یہ صرف ایک بار معراج کے موقع پر ہوا۔ نماز کی فرضیت اسی موقع پر ہوئی۔

۵:-حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے سامنے آئے بغیر آپ ﷺ کے قلب مبارک پر کوئی بات القاء فرما دیتے تھے۔

## تاریخ نزولِ قرآن

ماہِ رمضان کی ایک بابرکت رات لیلۃ القدر میں اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر قرآن کریم نازل فرمایا اور اس کے بعد حسبِ ضرورت تھوڑا تھوڑا حضورِ اکرم ﷺ پر نازل ہوتا رہا اور تقریباً ۲۳ سال کے عرصہ میں قرآن کریم مکمل نازل ہوا۔ قرآن کریم کا تدریجی نزول اُس وقت شروع ہوا جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال تھی۔ قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں غارِ حرا میں اُتریں، وہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں۔ اس پہلی وحی کے نزول کے بعد تین سال تک وحی کے نزول کا سلسلہ بند رہا۔ تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں آیا تھا، آپ ﷺ کے پاس آیا اور سورۃ المدثر کی ابتدائی چند آیات آپ ﷺ پر نازل فرمائیں۔ اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ کی وفات تک وحی کے نزول کا تدریجی سلسلہ جاری رہا۔ غرض تقریباً ۲۳ سال کے عرصہ میں قرآن کریم مکمل نازل ہوا۔

## حفاظتِ قرآن

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ قرآن کریم ایک ہی دفعہ میں نازل نہیں ہوا، بلکہ ضرورت اور حالات کے اعتبار سے مختلف آیات نازل ہوتی رہیں۔ قرآن کریم کی حفاظت کے لیے سب سے پہلے حفظِ قرآن پر زور دیا گیا، چنانچہ خود حضورِ اکرم ﷺ الفاظ کو اسی وقت دہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد

ہو جائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی نازل ہوئی کہ عین نزولِ وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ خود آپ میں ایسا حافظہ پیدا فرما دے گا کہ ایک مرتبہ نزولِ وحی کے بعد آپ اسے بھول نہیں سکیں گے۔ اس طرح حضور اکرم ﷺ پہلے حافظ قرآن ہیں، چنانچہ ہر سال ماہِ رمضان میں آپ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کے نازل شدہ حصوں کا دور فرمایا کرتے تھے۔ جس سال آپ ﷺ کا انتقال ہوا، اس سال آپ ﷺ نے دو بار قرآن کریم کا دور فرمایا۔ پھر آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انہیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے۔ خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کریم یاد کرنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا۔ چنانچہ ہمیشہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک اچھی خاصی جماعت ایسی رہتی جو نازل شدہ قرآن کی آیات کو یاد کر لیتی اور راتوں کو نماز میں دہراتی تھی۔ غرضیکہ قرآن کی حفاظت کے لیے سب سے پہلے حفظِ قرآن پر زور دیا گیا اور اُس وقت کے لحاظ سے یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابلِ اعتماد تھا۔

قرآن کریم کی حفاظت کے لیے حضور اکرم ﷺ نے قرآن کریم کو لکھوانے کا بھی خاص اہتمام فرمایا، چنانچہ نزولِ وحی کے بعد آپ کاتبینِ وحی کو لکھوا دیا کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرماتے تھے کہ: اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے۔ اس زمانہ میں کاغذ دستیاب نہیں تھا، اس لیے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانور کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں۔ کاتبینِ وحی میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام خاص طور پر ذکر کیے جاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں جتنے قرآن کریم کے نسخے لکھے گئے تھے، وہ عموماً متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب جنگِ یمامہ کے دوران حفاظِ قرآن کی ایک بڑی جماعت شہید ہوگئی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو قرآن کریم ایک جگہ جمع کروانے کا مشورہ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ابتداء میں اس کام کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن شرح صدر کے بعد وہ بھی اس عظیم کام کے لیے تیار ہوگئے اور کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس اہم وعظیم عمل کا ذمہ دار بنایا۔ اس طرح قرآن کریم کو ایک جگہ جمع کرنے کا اہم کام شروع ہوگیا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ خود کاتبِ وحی ہونے کے ساتھ پورے قرآن کریم کے حافظ تھے۔ وہ اپنی یادداشت سے بھی پورا قرآن لکھ سکتے تھے، اُن کے علاوہ اُس وقت سینکڑوں حفاظِ قرآن موجود تھے، مگر

انہوں نے احتیاط کے پیشِ نظر صرف ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اُس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفے میں درج نہیں کی، جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں۔ اس کے علاوہ حضور اکرم ﷺ نے قرآن کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں، وہ مختلف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے انہیں یکجا فرمایا، تاکہ نیا نسخہ ان ہی سے نقل کیا جائے۔ اس طرح خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں قرآن کریم ایک جگہ جمع کردیا گیا۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر دور دراز عجمی علاقوں تک پھیل گیا تھا۔ ہر نئے علاقہ کے لوگ ان صحابہؓ وتابعینؒ سے قرآن سیکھتے، جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم حضور اکرم ﷺ سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لیے ہر صحابیؓ نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا جس کے مطابق خود انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے پڑھا تھا۔ اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا۔ لوگوں نے اپنی قراءت کو حق اور دوسری قراءتوں کو غلط سمجھنا شروع کردیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اجازت ہے کہ مختلف قراءتوں میں قرآن کریم پڑھا جائے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ اُن کے پاس (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تیار کرائے ہوئے) جو صحیفے موجود ہیں، وہ ہمارے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں ایک کمیٹی تشکیل دے کر ان کو مکلّف کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صحیفہ سے نقل کرکے قرآن کریم کے چند ایسے نسخے تیار کریں جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، چنانچہ قرآن کریم کے چند نسخے تیار ہوئے اور ان کو مختلف جگہوں پر ارسال کردیا گیا، تاکہ اسی کے مطابق نسخے تیار کرکے تقسیم کردیئے جائیں۔

اس طرح اُمتِ مسلمہ میں اختلاف باقی نہ رہا اور پوری اُمتِ مسلمہ اسی نسخہ کے مطابق قرآن کریم پڑھنے لگی۔ بعد میں لوگوں کی سہولت کے لیے قرآن کریم پر نقطے وحرکات (یعنی زبر، زیر اور پیش) بھی لگائے گئے، نیز بچوں کو پڑھانے کی سہولت کے مدِنظر قرآن کریم کو تیس پاروں میں تقسیم کیا گیا۔ نماز میں تلاوتِ قرآن کی سہولت کے لیے رکوع کی ترتیب بھی رکھی گئی۔

## فضائلِ قرآن

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’قرآن کا ماہر جس کو خوب یاد ہو، خوب پڑھتا ہو، اُس کا حشر

فرشتوں کے ساتھ قیامت کے دن ہوگا۔‘‘ (بخاری) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’قیامت کے دن صاحبِ قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور جنت کے درجوں پر چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا، پس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔‘‘ (مسلم) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا، جس کی روشنی سورج کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی۔ اگر وہ آفتاب تمہارے گھروں میں ہو تو کیا گمان ہے تمہارا اُس شخص کے بارے میں جو خود اس پر عمل پیرا ہو؟!۔‘‘ (ابوداود)

## فہمِ قرآن

اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم میں تدبر وتفکُّر کرنے کا حکم دیا ہے، مگر یہ تدبُّر وتفکُّر مفسرِ اول حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کی روشنی میں ہی ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے ارشاد فرمایا ہے: ’’یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اُتاری ہے، تاکہ لوگوں کی جانب جو حکم نازل فرمایا گیا ہے، آپ اسے کھول کھول کر بیان کردیں، شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔‘‘ (النحل: ۴۴) ’’یہ کتاب ہم نے آپ پر اس لیے اُتاری ہے، تاکہ آپ ان کے لیے ہر اس چیز کو واضح کردیں جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔‘‘ (النحل: ۶۴) اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیات میں واضح طور پر بیان فرمادیا کہ قرآن کریم کے مفسرِ اول حضور اکرم ﷺ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ آپ ﷺ اُمتِ مسلمہ کے سامنے قرآن کریم کے احکام ومسائل کھول کھول کر بیان کریں۔ اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے اقوال وافعال کے ذریعہ قرآن کریم کے احکام ومسائل بیان کرنے کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دی۔ صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے ذریعہ حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال یعنی حدیثِ نبوی کے ذخیرہ سے قرآن کریم کی پہلی اہم اور بنیادی تفسیر انتہائی قابلِ اعتماد ذرائع سے اُمتِ مسلمہ کو پہنچی ہے، لہٰذا قرآن فہمی حدیث کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

## مضامینِ قرآن

علماء کرام نے قرآن کریم کے مضامین کی مختلف قسمیں ذکر فرمائی ہیں، تفصیلات سے قطع نظر ان مضامین کی بنیادی تقسیم اس طرح ہے:

۱:-عقائد ۲:-احکام ۳:-قصص۔

قرآن کریم میں عمومی طور پر صرف اُصول ذکر کیے گئے ہیں، لہٰذا عقائد واحکام کی تفصیل احادیثِ نبویہ میں ہی ملتی ہے، یعنی قرآن کریم کے مضامین کو ہم احادیثِ نبویہ کے بغیر نہیں سمجھ سکتے ہیں۔

## قرآن اور ہماری ذمہ داری

یہ کتابِ مقدس حضور پاک ﷺ کے زمانہ سے لے کر رہتی دنیا تک مشعلِ راہ بنی رہے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اتنا جامع اور مانع بنایا ہے کہ ایمانیات، عبادات، معاملات، سماجیات، معاشیات و اقتصادیات کے اصول قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ ہاں! ان کی تفصیلات احادیثِ نبویہ میں موجود ہیں۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا تعلق اس کتاب سے روز بروز منقطع ہوتا جارہا ہے۔ یہ کتاب ہماری مسجدوں اور گھروں میں جزدانوں میں قید ہوکر رہ گئی ہے، نہ تلاوت ہے نہ تدبر ہے اور نہ ہی اس کے احکام پر عمل، آج کا مسلمان دنیا کی دوڑ میں اس طرح گم ہوگیا ہے کہ قرآن کریم کے احکام ومسائل کو سمجھنا تو درکنار اس کی تلاوت کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے دور کے مسلمانوں کے حال پر روناروتے ہوئے اسلاف سے اس وقت کے مسلمان کا مقارنہ ان الفاظ میں کیا تھا:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

آج ہم اپنے بچوں کی دنیاوی تعلیم کے بارے میں سوچتے ہیں، انہیں عصری علوم کی تعلیم دینے پر اپنی تمام محنت وتوجہ صرف کرتے ہیں اور ہماری نظر صرف اور صرف اس عارضی دنیا اور اس کے آرام وآسائش پر ہوتی ہے اور اُس ابدی ولافانی دنیا کے لیے کوئی خاص جدوجہد نہیں کرتے، الا ماشاء اللہ۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنا اور اپنے بچوں کا تعلق وشغف قرآن وحدیث سے جوڑیں، اس کی تلاوت کا اہتمام کریں، علماء کی سرپرستی میں قرآن وحدیث کے احکام سمجھ کر ان پر عمل کریں اور اس بات کی کوشش وفکر کریں کہ ہمارے ساتھ، ہمارے بچے، گھر والے، پڑوسی، دوست واحباب ومتعلقین بھی حضور اکرم ﷺ کے لائے ہوئے طریقہ پر زندگی گزارنے والے بن جائیں۔ آج عصری تعلیم کو اس قدر فوقیت واہمیت دی جارہی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو قرآن کریم ناظرہ کی بھی تعلیم نہیں دی جارہی ہے، کیونکہ ان کو اسکول جانا ہے، ہوم ورک کرنا ہے، پروجیکٹ تیار کرنا ہے، امتحانات کی تیاری کرنی ہے، وغیرہ وغیرہ، یعنی دنیاوی زندگی کی تعلیم کے لیے ہر طرح کی جان ومال اور وقت کی قربانی دینا آسان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے کلام کو سیکھنے میں ہمیں دشواری محسوس ہوتی ہے۔ غور فرمائیں کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے ہماری رہنمائی کے لیے نازل فرمایا ہے اور اس کے پڑھنے پر اللہ تعالیٰ نے بڑا اَجر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھنے والا اور قرآن وحدیث کے احکام پر عمل کرنے والا بنائے، آمین۔

# معاملات سے ابہام دور کیجیے!

مفتی محمد اویس ارشاد
مدرس ومفتی دار العلوم عیدگاہ، کبیر والا

اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری دین ہے، جس پر ایمان لانا تا قیامت آنے والی تمام اقوامِ عالَم کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام ایک جامع دین ہے جو عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاملات، غرض انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق انہیں صحیح ومکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اوپر ذکر کیے گئے اُمور میں سے چند ایک پر عمل کرکے دیگر میں شرعی تعلیمات کو نظر انداز کرنا اسلامی رو سے نقصان فی الدین ہے۔ کامل دین دار شخص وہی ہے جو عقائد سے لے کر معاملات تک تمام شعبہ ہائے زندگی میں اسلام تعلیمات کو اپنے اوپر لاگو کرتا ہو، تب ہی وہ اپنے مقصدِ تخلیق یعنی رضائے الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کی سعادت کا مستحق ٹھہرے گا۔

معاملاتِ انسانی زندگی کی اہم ضرورت ہیں، ہر انسان کو روزانہ متعدد لوگوں سے معاملات کرنا ہوتے ہیں، کیونکہ انسان اپنی تمام ضروریات خود پورا کرنے پر قادر نہیں ہے، انسانوں میں من جانب اللہ ذمہ داریاں تقسیم کردی گئی ہیں، ہر شخص کسی نہ کسی انسان کی کوئی نہ کوئی ضرورت مہیا کرنے کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ انسانی زندگی کے چوبیس گھنٹوں میں روزانہ اُسے سینکڑوں معاملات کرنے ہوتے ہیں، اس لیے اپنی پوری زندگی اللہ کی رضا میں گزارنے کا محض یہی طریقہ ہے کہ عقائد وعبادات کے ساتھ ساتھ معاملات میں بھی شرعی تعلیمات کی پابندی کی جائے۔

معاملات کے متعلق اسلامی تعلیمات کا باب طویل ہے۔ ان میں سے ایک اہم بنیادی اُصول یہ ہے کہ معاملہ کرتے ہوئے اُس میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہنے دیا جائے۔ معاملہ کی تمام شقیں صاف واضح، متعین ہوجانا ضروری ہیں۔ معاملات میں ابہام نہ صرف یہ کہ بعد میں نزاع اور لڑائی جھگڑے کا باعث بنتا ہے، بلکہ گناہ بھی ہے۔

قرآن مجید کا ارشادِ گرامی ہے:

’’یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا.‘‘ (الأحزاب:۷۰)

ترجمہ: ’’اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو، اور سیدھی بات کیا کرو۔‘‘

یعنی صاف صاف بات کیا کریں، گول مول، غیر واضح اور مبہم بات نہ کریں۔ یہ تعلیم ہر اُس معاملہ پر منطبق ہوتی ہے جو زبان یا تحریر سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہر معاملہ کو تمام شرائط طے کر کے واضح کر دیا جائے۔ ہمارے ہاں بہت سے معاملات میں بنیادی اُصولوں اور ضروری اُمور کو ایک دوسرے پر اعتماد کرنے یا دوسرے کی ناراضگی کے خوف سے مبہم رہنے دیا جاتا ہے، بعد میں اس کا نتیجہ لڑائی جھگڑے اور معاملات کی انتہائی پیچیدگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ معاملات میں ابہام کی بہت سی صورتیں ہمارے ہاں رائج ہیں، ان میں سے چند کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

## عارضی طور پر زمین بیٹے کے نام کرانے کا مسئلہ

بسا اوقات والد کسی وجہ سے زمین یا گھر وغیرہ محض کاغذات کی حد تک کسی بیٹے، بیٹی کے نام کرا دیتے ہیں، مالک بنانا مطلوب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات دستاویزی صورت میں گواہوں کے سامنے واضح نہیں کی جاتی، مبہم رہنے دیا جاتا ہے۔ بعد میں کسی موڑ پر اختلافات ہو جاتے ہیں، جس کے نام عارضی طور پر کرائی گئی تھی، وہ اپنے مالک ہونے کے مدعی ہو کر والد کو واپس دینے یا والد کے انتقال کے بعد دیگر ورثاء کو اُس میں سے حصہ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔

اس لیے ایسا معاملہ کرتے ہوئے ضروری ہے کہ گواہوں کے سامنے دستاویزی صورت میں وضاحت کر دی جائے کہ جس کے نام کرائی جا رہی ہے، یہ عارضی طور پر ہے، بطورِ ہبہ وملکیت کے نہیں ہے۔

## اولاد کو کاروبار میں شامل کرنے کا مسئلہ

ابہام کی ایک مروجہ صورت یہ ہے کہ والد اپنے چلتے کاروبار میں بیٹے کو شامل کرتا ہے، بیٹا والد کے ساتھ کام کرتا ہے، وقت دیتا ہے، ذمہ داری سنبھالتا ہے، لیکن کچھ طے نہیں کیا جاتا کہ بیٹا اِس کاروبار میں کس حیثیت سے شریک ہو رہا ہے؟ آیا صرف والد کا معاون ہے، تنخواہ دار کی حیثیت سے ہے؟ یا کاروبار میں سے کچھ حصہ اُس بیٹے کی ملکیت میں دیا گیا ہے؟ اِس غیر مبہم معاملہ کی وجہ سے بعد میں یہ فسادات پیدا ہوتے ہیں:

۱:- اِس بیٹے کی زندگی والد کے کاروبار میں معاونت کرتے ہوئے صَرف ہو جاتی ہے،

جبکہ دیگر بیٹے الگ سے کاروبار یا تعلیم میں مصروف رہ کر اپنا کیریئر بنا لیتے ہیں، والد کے انتقال کے بعد پوری زندگی والد کے ساتھ بطورِ معاون کام کرنے والا اور دیگر اولاد کاروبار میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں، جب کہ دیگر اولاد نے الگ سے اپنا بزنس، ملازمت سے بھی بہت کچھ حاصل کرلیا ہوتا ہے۔

۲:- بسا اوقات ایسی صورت حال میں کاروبار میں کام کرنے والا بیٹا تمام کاروبار کو اپنی ملک سمجھ کر خود قابض ہو جاتا ہے، دیگر ورثاء کو کچھ بھی دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ بیٹے کو کاروبار میں شامل کرتے وقت دستاویزی صورت میں درج ذیل اُمور طے کرلیے جائیں:

الف:- بیٹے کی حیثیت ملازم کی ہے تو اُس کی یومیہ، ماہانہ یا سالانہ تنخواہ طے کردی جائے۔ اس صورت میں بیٹا طے شدہ تنخواہ کا حق دار ہوگا، کاروبار کے مالک والد ہوں گے، اُن کے انتقال کے بعد تمام ورثاء میں شرعی حصہ کے بقدر تقسیم ہوگا۔

ب:- کاروبار میں ساتھ کام کرنے والے بیٹے کا کاروبار میں کچھ ملکیتی حصہ طے کر کے اسے مالک بنا کر شریک کر دیا جائے اور منافع کی تقسیم فیصدی تناسب یا ملکیت کے اعتبار سے طے کر لی جائے۔

ج:- اگر بیٹے کو کاروبار میں کام کے لیے شامل کرتے وقت اُس کی تنخواہ یا ملکیت وغیرہ کچھ طے نہیں کیے گئے، تو بیٹے کی حیثیت محض معاون کی ہوگی، تمام کاروبار والد کی ملکیت میں رہے گا، اس کی مزید تفصیل سطورِ بالا میں عرض کی گئی ہے۔

اگر یہ صورتیں واضح کر دی جائیں تو بعد میں جھگڑوں سے یا غیرشرعی کاموں کے ارتکاب سے بچا جا سکتا ہے۔

## اولاد کو کاروبار کے لیے رقم مہیا کرنے کا مسئلہ

ہمارے ہاں کثرت سے رائج ایک صورت وہ ہے جب والد اولاد کو یا اولاد میں سے کسی ایک کو کاروبار شروع کرنے کے لیے رقم مہیا کرتے ہیں۔ والد کی طرف سے مہیا کی گئی رقم سے کاروبار میں جب ترقی ہوتی ہے، تو بھائیوں میں جھگڑے ہوتے ہیں، کاروبار کرنے والا اسے محض اپنا ذاتی کاروبار سمجھتا ہے، دیگر بھائی بہن وراثت میں سے ہونے کے مدعی ہوتے ہیں، اور صورتِ حال کسی پر بھی واضح نہیں ہوتی، اِس نوبت سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ ابتداء میں کاروبار شروع کرنے کے لیے رقم مہیا کرتے ہوئے والد درج ذیل تصریح کر دے:

الف: - یہ رقم بطورِ قرض کے ہے۔ ب: - بطورِ گفٹ کے ہے۔

ج: - اس طور پر ہے کہ بیٹا والد کا معاون بن کر والد کا کاروبار شروع کر دے۔

پہلی دو صورتوں (الف اور ب) میں کاروبار کا مالک بیٹا ہوگا، البتہ الف کی صورت میں قرض واپس کرنے کا پابند ہوگا۔

تیسری (ج) صورت میں کاروبار کے مالک والد ہوں گے، بیٹا اُن کا معاون یا تنخواہ دار ہوگا، اس صورت میں بیٹے کے کام کرنے کی حیثیت الگ سے متعین کرنا ضروری ہے۔

## بیٹے کی کمائی سے خریدی گئی جائیداد کا مسئلہ

بیٹا بیرونِ ملک کمائی کرتا ہے، اپنی آمدن گھر بھیجتا رہتا ہے، جسے بعض اوقات زمین، جائیداد وغیرہ کی خریداری میں صَرف کیا جاتا ہے۔ بیٹے کی کمائی سے حاصل شدہ رقم سے خریداری کرتے ہوئے یہ ابہام دور نہیں کیا جاتا کہ یہ زمین کس کی ملک کی ہے؟ کمائی کرنے والے بیٹے کی ہے، یا والد، والدہ کی؟ بلکہ بعض مرتبہ یہ زمین کسی اور بھائی کے نام کر دی جاتی ہے۔

والد کے انتقال کے بعد یا جب کمائی کرنے والا بیٹا واپس آتا ہے تو وہ مطالبہ کرتا ہے کہ میری کمائی سے خریدی گئی جائیداد اُس کی ملکیت ہے، قابض بہن بھائی انکاری ہو جاتے ہیں، اِس لیے ابتداء سے ہی ان باتوں کی وضاحت لازمی ہے:

۱: - اسے بیرونِ ملک بھیجنے پر جو رقم خرچ کی جا رہی ہے، یہ بطورِ قرض کے ہے یا بطورِ تبرع واحسان؟

۲: - بیٹا اپنی آمدن گھر والوں کو کس حیثیت سے دیتا ہے، آیا بطورِ امانت کے بھیجتا ہے یا کسی کو مالک بنا دیتا ہے، مالک بناتا ہے تو کسے مالک بناتا ہے؟

۳: - بیٹے کی آمدن سے جو جائیداد خریدی گئی، اِس کا مالک کون ہے؟ والد نے اپنے لیے خریدی یا اُسی بیٹے کے لیے خریدی؟

یہ اُمور ابتداء سے ہی واضح ہوں تو بعد کے تمام معاملات خوش اسلوبی سے نمٹ جاتے ہیں، ورنہ صورتِ حال اتنا پیچیدہ ہوتی ہے کہ مفتی کو معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے پریشانی لاحق ہو جاتی ہے۔

## گھر کے سربراہ کے کاروبار کے لیے رقم مہیا کرنے کا مسئلہ

ابہام کی ایک پیچیدہ صورت یہ بھی پیش آتی ہے کہ گھر کے سربراہ کے چلتے کاروبار میں گھر کے

کسی فرد کی رقم لگائی جاتی ہے، مثلاً بیٹے کی ذاتی کمائی یا خواتین کے زیور بیچ کر حاصل شدہ رقم کاروبار میں لگادی جاتی ہے، اور واضح طے نہیں کیا جاتا کہ یہ رقم کاروبار میں کس حیثیت سے شامل کی گئی ہے، نہ ہی رقم شامل کرنے کی کوئی دستاویز بنائی جاتی ہے۔ آگے چل کر معاملات گھمبیر ہوجاتے ہیں، اولاً تو دیگر ورثاء رقم کی شمولیت سے منکر ہوتے ہیں، اور اگر اسے تسلیم کربھی لیں تو اِس میں اختلاف ہوجاتا ہے کہ وہ رقم قابلِ واپسی تھی یا گفٹ تھی؟ رقم قابلِ واپسی ہونا تسلیم کرلیں تو اگلا اختلاف ہوجاتا ہے کہ اِس رقم کے منافع بھی ملیں گے یا نہیں؟

ان تمام خرابیوں سے بچنے کے لیے ابتداء سے ہی درج ذیل تفصیلات واضح کرنا ضروری ہیں:

۱:- رقم کی شمولیت باقاعدہ مصدقہ دستاویز کی صورت میں لکھ لی جائے۔

۲:- طے کرلیا جائے کہ رقم کس حیثیت سے شامل کی جارہی ہے؟ گھر کا فرد، سربراہ کو وہ رقم ہبہ کررہا ہے یا بطورِ قرض کے دے رہا ہے؟

۳:- اور اگر وہ رقم بطورِ پارٹنر شپ کے دی جارہی ہے تو واضح کیا جائے کہ مجموعی کاروبار میں اِس رقم کا تناسب کیا ہے؟ بالفاظِ دیگر کاروبار میں اِس فرد کی ملکیت کتنا ہوگی؟ اِس صورت میں منافع کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی؟ یہ طے کرنا بھی ضروری ہے۔

## مشترکہ فیملی کے افراد کی آمدن کا مسئلہ

معاملات کی پیچیدگی اور غیرواضح ہونے کی کثیرالرائج صورت جوائنٹ فیملی سسٹم میں پیش آتی ہے، مثلاً ہر بھائی کی اپنی آمدن ہے، ہر بھائی اپنی آمدن گھر کے سربراہ (والد، والدہ، یا بھائی) کے پاس جمع کرادیتے ہیں، جس سے گھر کے اخراجات بھی ہوتے ہیں، اور اُس سے جائیداد وغیرہ بھی خریدی جاتی ہے، کاروبار بھی شروع کیے جاتے ہیں۔ یہ مشترکہ سسٹم بسااوقات شدید اختلاف پر منتج ہوتا ہے۔ جس بھائی کی آمدن زیادہ تھی، وہ جائیداد میں سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے، دیگر بھائی برابری کے دعویدار ہوتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال سے بچنے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ شروع میں یہ طے کرلیا جائے:

۱:- تمام بھائی سربراہ کو وہ رقم مالک بنا کر دیتے ہیں؟ اِس صورت میں اُس رقم سے خریدی گئی جائیداد وغیرہ اُسی سربراہ کی ہوگی اور اُس کی موت کے بعد اُس کے شرعی ورثاء میں بقدرِ حصہ تقسیم ہوگی۔

۲:- سربراہ کو دی جانے والی رقم بطورِ تملیک کے نہیں، بلکہ جائیداد وغیرہ کی خریداری اور اخراجات کے لیے ہے۔ اِس صورت میں اخراجات کے بعد ہر ایک کی رقم کا الگ حساب رکھنا

ضروری ہے، اگر اُس سے کوئی جائیداد وغیرہ خریدی گئی تو حساب رکھنا ضروری ہے کہ کس بھائی کی کتنی رقم خرچ ہوئی، اسی رقم کے اعتبار سے جائیداد میں ملکیت کا تناسب ہوگا۔

جوائنٹ فیملی سسٹم میں بہتر، غیر پیچیدہ طریقہ یہ ہے کہ کچن وغیرہ روزمرہ کے اخراجات میں چاہے مشترکہ سسٹم رہے، اور اس کے لیے باقاعدہ ایک فنڈ قائم کیا جائے، جس میں ہر بھائی اپنے زیرِ کفالت افراد کے اعتبار سے یا برابر برابر رقم جمع کرادیں، وہ رقم روزمرہ کے اخراجات میں خرچ ہوگی۔ ان اخراجات کے علاوہ ہر بھائی اپنی دیگر آمدن کا خود مالک ہوگا، وہ چاہے خرچ کرے، محفوظ کرے، جائیداد خریدے، وہ اسی کی شمار ہوگی۔ اِس صورت میں کم زیادہ آمدن کے پیچیدہ مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔

## وراثتی گھر کی مرمت پر خرچ

اسی طرح بہن بھائیوں میں مشترکہ وراثتی گھر کی مرمت وغیرہ پر کوئی ایک بھائی خرچ کرتا ہے، یہ خرچ اگر واپسی کی نیت سے بطورِ قرض کے ہو تو خرچ کرنے سے پہلے تمام ورثاء پر واضح کرنا ضروری ہے۔

## بہو کو سُسرال کی طرف سے زیور پہنانے کا مسئلہ

خاتون کو اُس کے سُسرال، شوہر کی طرف سے زیور پہنائے جاتے ہیں، بعض جگہ تو معروف ہوتا ہے کہ یہ زیور بطورِ عاریت کے ہوتے ہیں، اصل مالک شوہر ہی رہتا ہے۔ بعض جگہ ہبہ کا عُرف ہوتا ہے، بیوی مالکہ بن جاتی ہے۔ لیکن بعض جگہ یہ عُرف نہیں ہوتا، ایسی صورت میں واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ زیور خاتون کو مالک بنا کر دیا جارہا ہے، یا صرف استعمال کے لیے؟ عُرف یا وضاحت نہ ہونے کی صورت میں طلاق یا موت کے بعد اختلافات ہوجاتے ہیں۔ ان اختلافات سے بچاؤ کی یہی صورت ہے کہ پہلے سے معاملہ واضح کردیا جائے۔

سطورِ بالا میں مبہم معاملات کی وہ صورتیں ذکر کی گئی ہیں، جو عموماً گھر والوں کے آپس کے معاملات میں پیش آتی ہیں، ان کے علاوہ دیگر معاملات بیع، اجارہ، نکاح وغیرہ میں بھی ابہام باقی رکھنے کا رواج بہت زیادہ ہے، جو بالآخر جھگڑوں پر منتج ہوکر دلوں کی دوری کا باعث بنتے ہیں، اس لیے تمام معاملات میں ابہام کو دور کرنا چاہیے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

# رکعاتِ تراویح بیس یا آٹھ.....!

مولانا احسان اللہ احسان

حق جل مجدہٗ نے اس اُمتِ محمدیہ پر اپنے بے پناہ احسانات میں سے ایک احسان رمضان المبارک کی صورت میں بھی فرمایا اور پھر اس ایک احسان میں اللہ جل جلالہٗ کے اَن گنت احسانات اور انعامات چھپے ہوئے ہیں، جن کا شمار ہم جیسے ضعفاء کے بس سے باہر ہے۔ خود قرآن کریم ہی کی گواہی ہے: ''وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا .'' (ابراہیم:۳۴)..... ''اللہ کی نعمتوں کو اگر گننا چاہو تو تم نہیں گن سکتے۔'' عجیب بابرکت و باعظمت مہینہ ہے، گویا عالم روحانیت کا موسم بہار ہے۔ اس ماہ مبارک میں ایک نفل کا ثواب فرض کے برابر اور ایک فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر کر دیا جاتا ہے۔ کتنے خوش بخت و خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو رمضان المبارک میں اپنی زندگی کے لمحات کو قیمتی بنا لیتے ہیں اور کثرتِ عبادت و تلاوت میں مشغول ہو جاتے ہیں، مگر آہ! کچھ ایسے بھی ہیں جو لوگوں کو بجائے کثرت کے قلت کی طرف کھینچنے لگتے ہیں اور بزعم خود وہ اس بات کو کارِ خیر بھی سمجھتے ہیں:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ❊ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

رمضان المبارک میں دن کا روزہ فرض اور رات کی تراویح مسنون ہے، حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد منقول ہے:

''جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلَة تَطَوُّعًا.'' (مشکوٰۃ، ص:۱۷۳)

''اللہ تعالیٰ نے اس کے (دن کے) روزہ کو فرض اور رات کے قیام (یعنی تراویح) کو ثواب کی چیز بنایا۔''

ایک اور روایت میں ہے:

''وَسَنَنْتُ لَكُمْ قِيَامَهٗ.'' (نسائی، ج:۱، ص:۲۳۹)

''میں نے اس کے قیام (تراویح) کو تمہارے لیے سنت بنایا ہے۔''

## تراویح عہدِ نبوی میں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دورِ مبارک میں تراویح کی ترغیب بھی ارشاد فرمائی اور اس کی فضیلت بھی بہت بیان فرمائی، چنانچہ حدیث پاک میں ہے: ''جس نے رمضان کا روزہ رکھا، ایمان اور ثواب کی نیت سے اس کے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور جس نے رمضان مبارک میں قیام (تراویح) کیا، اس کے بھی سارے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔'' (مشکوٰۃ، ص:۱۷۳)

ایک اور حدیث میں ہے:

''إِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ عَلَيْكُمْ صِيَامَ رَمَضَانَ وَسَنَنْتُ لَكُمْ قِيَامَهُ، فَمَنْ صَامَهُ وَقَامَهُ إِيْمَانًا وَ احْتِسَابًا خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِهٖ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهٗ۔'' (جامع الاصول، ج:۹، ص:۴۴۱، بروایت نسائی)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کا روزہ فرض کیا ہے اور اس نے تمہارے لیے اس قیام کو سنت قرار دیا ہے۔ پس جس نے ایمان کے جذبے اور ثواب کی نیت سے اس کا صیام (روزہ) و قیام کیا، وہ اپنے گناہوں سے ایسا نکل جائے گا، جیسا کہ جس دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔''

دیکھیے! کتنی بڑی فضیلت ہے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جماعت کے ساتھ چند راتوں کے سوا ادا نہیں فرمایا۔ وہ چند راتیں کونسی تھیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت صلوٰۃ تراویح ادا فرمائی؟ سنئے! حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے مہینے میں ہمیں رات میں نماز نہیں پڑھائی، یہاں تک کہ سات دن باقی رہ گئے تو (تیئیسویں رات میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی، یہاں تک کہ تہائی رات گزر گئی۔ جب چھ دن رہ گئے تو نماز نہیں پڑھائی (یعنی چوبیسویں رات میں) پھر جب پانچ دن رہ گئے تو نماز پڑھائی (یعنی پچیسویں رات میں) یہاں تک کہ آدھی رات گزر گئی۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر آپ اس رات کے باقی حصے میں بھی ہمیں نفل پڑھا دیتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص امام کے ساتھ نماز (عشاء) پڑھے، پھر اپنے گھر واپس جائے تو پوری رات نماز پڑھنے والا شمار کیا جائے گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب چار دن رہ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز نہیں پڑھائی (یعنی چھبیسویں رات میں) جب تین دن باقی رہ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں، عورتوں، اور دیگر لوگوں کو جمع کیا اور نماز پڑھائی (یعنی ستائیسویں رات میں) اتنی لمبی نماز پڑھائی کہ ہمیں یہ اندیشہ ہونے لگا کہ ہم سے فلاح رہ جائے گی۔ حضرت جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: فلاح رہ جانے کا کیا مطلب ہے؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سحری مراد ہے، پھر باقی ایام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز

نہیں پڑھائی۔ (ابوداؤد، ج:۱،ص:۱۹۵)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ کی رات میں تہائی رات تک ۲۵ ویں رات میں آدھی رات تک اور ۲۷ کی رات میں سحری تک نماز پڑھائی۔ اس کے بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نہیں پڑھائی، کیوں نہیں پڑھائی؟ اس کا جواب بھی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ درمیان رات میں گھر سے تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لوگوں نے بھی وہی نماز پڑھی، جب صبح ہوئی تو لوگوں نے (پچھلی رات کی نماز کا) تذکرہ آپس میں کیا۔ چنانچہ دوسری رات پہلے سے زیادہ تعداد ہوگئی، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی نماز لوگوں نے بھی پڑھی۔ صبح ہوئی تو پھر چرچا ہوا اور تیسری رات لوگوں کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ گئی، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگوں نے بھی وہی نماز پڑھی۔ جب چوتھی رات آئی تو مسجد نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے تنگ ہوگئی، اس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے لیے تشریف لائے، جب نماز ادا کرلی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا: تمہارا یہاں آنا مجھ پر مخفی نہیں تھا، لیکن میں ڈرا کہ کہیں (تمہارے اس شوق و ذوق اور رغبت کو دیکھ کر اللہ کی طرف سے) تم پر یہ نماز فرض نہ ہو جائے اور تم اس کے ادا کرنے سے عاجز ہو جاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور معاملہ اس طرح رہا۔ (بخاری، ج:۱،ص:۲۶۹، مسلم، ج:۱،ص:۲۵۹)

اُمید ہے کہ اب بات سمجھ آگئی ہوگی کہ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے تین راتوں کے بعد یہ نماز کیوں نہیں پڑھائی؟! پھر سنئے! اُمت پر شفقت اور ترس تھا کہ میری اُمت بڑی کمزور ہے، کہیں اللہ کی طرف سے فرضیت کا حکم نہ آجائے، بایں وجہ تین راتیں جماعت کروا کر جماعت کا ثبوت بھی امت کو عطا فرمادیا اور اس نماز کے اُمت پر فرض ہونے سے بھی امت کو بچادیا، فصلی اللّٰہ علیہ وسلم تسلیما کثیرًا کثیرًا أبدًا۔

### حضور صلی اللہ علیہ وسلم کتنی رکعتیں پڑھا کرتے تھے رمضان میں ......؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت (تراویح) اور وتر پڑھا کرتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۲،ص:۲۹۴۔ بیہقی، ج:۲،ص:۴۹۶)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک رات رمضان المبارک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چوبیس رکعت (۴ عشاء کے فرض اور ۲۰ تراویح) پڑھائیں اور تین رکعت وتر پڑھائے۔ (تاریخ جرجان للسہمی، ص:۲۷۰)

ا:...... ہم نے یہ دو حدیثیں بیس رکعات کے ثبوت پر پیش کر دی ہیں۔ اس باب میں ہمارے لیے ''اصل'' اہلِ سنت والجماعت کے چار اُصول (قرآن، سنت، اجماع اور قیاس) میں سے تیسرا اصول ''اجماع'' ہے، جیسا کہ آئندہ صفحات میں ان شاء اللہ! آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ جہاں تک حضرات غیر مقلدین کی بات ہے، وہ تو ان احادیث کو سرے سے ضعیف یا غیر صحیح کہہ بھی نہیں سکتے کہ ان کے اصول دو ہیں: قرآن وحدیث۔ نہ قرآن میں ان احادیث کو ضعیف کہا گیا، نہ ہی حدیث میں ان پر ضعف کا حکم لگایا گیا۔ کسی اُمتی کا قول ماننا ان کے ہاں شرک ہے۔

۲:...... امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ''تلقی بالقبول'' سے حدیث صحیح ہو جاتی ہے اور اس بات کو اپنے اور غیر سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ بیس رکعت تراویح کو اُمت کی اکثریت کے ہاں ''تلقی بالقبول'' کا درجہ حاصل ہے۔

## خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی جاری کردہ سنت کے بارے میں وصیت نبوی

آگے جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی جاری کردہ سنت کی حیثیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک سے معلوم کرلیں۔ ارشادِ نبوی ہے:

''جو شخص تم میں سے میرے بعد جیتا رہا، وہ بہت سے اختلاف دیکھے گا، پس میری سنت کو اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کو لازم پکڑو، اسے مضبوطی سے تھام لو اور دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔ نئی نئی باتوں سے احتراز کرو، کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔'' (مشکوٰۃ، ج:۱، ص:۳۰)

اس حدیث مبارکہ سے ثابت ہو گیا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ (یعنی حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم) کی پیروی اور تابعداری لازمی اور ضروری ہے اور اس سے اعراض وانحراف اور اس کی مخالفت بدعت وگمراہی ہے، اس بات کو ذہن میں بٹھلا کر آگے چلتے ہیں۔ واللّٰہ المستعان

## تراویح عہد صدیقی میں

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں تراویح کا باقاعدہ جماعت کے ساتھ اہتمام نہیں تھا، بلکہ لوگ تنہا یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں پڑھتے تھے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں ایک رات مسجد میں تشریف لائے تو لوگوں کو مسجد کے ایک کونے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ ایک کہنے والے نے کہا: یا رسول اللہ! ان لوگوں کو قرآن یاد نہیں ہے، حضرت اُبی بن کعبؓ (نماز میں قرآن) پڑھ رہے ہیں اور یہ ان کی اقتداء میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: انہوں نے اچھا کیا، یا یہ فرمایا کہ: صحیح کیا، اور یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ناپسند نہیں کی۔'' (معرفۃ السنن والآثار للبیہقی، ج:۴،ص:۳۹، بحوالہ حدیث اور اہل حدیث،ص:۶۳۵)

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ایسا ہی معاملہ رہا۔ (اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم، حصہ دوم،ص:۲۷۲)

## عہدِ فاروقی

۱:...... حضرت عبدالرحمٰن ؒ فرماتے ہیں کہ: ''میں ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد کی طرف نکلا تو دیکھا کہ لوگ مختلف گروہوں میں متفرق ہیں، کوئی اکیلا نماز پڑھتا ہے اور کوئی ایسا تھا کہ ایک گروہ اس کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ اگر میں ان کو ایک قاری کے پیچھے اکٹھا کردوں تو زیادہ بہتر ہوگا، پھر آپؓ نے ان کو حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت پر اکٹھا کردیا۔ (بخاری، ج:۱،ص:۲۶۹، مسلم، ج:۱،ص:۲۵۹)

۲:...... حضرت یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعتیں پڑھائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۲،ص:۲۹۳)

۳:...... حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ میں رمضان میں لوگوں کو تراویح پڑھاؤں، پس بیس رکعت پڑھی جاتی تھیں۔ (کنز العمال، ج:۸،ص:۲۶۴)

۴:...... حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر اکٹھا کردیا، آپ رضی اللہ عنہ انہیں بیس رکعتیں پڑھاتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج:۱،ص:۴۰۰۔ جامع المسانید والسنن، ج:۱،ص:۵۵)

۵:...... حضرت عبدالعزیز بن رفیعؒ فرماتے ہیں کہ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رمضان المبارک میں مدینہ طیبہ میں لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھاتے تھے اور تین وتر پڑھاتے تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۲،ص:۳۹۳)

۶:...... حضرت یزید بن رومانؒ فرماتے ہیں کہ: لوگ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں رمضان میں (۲۳) رکعات پڑھا کرتے تھے (یعنی ۲۰ تراویح اور ۳ وتر)۔ (مؤطا امام مالک، ج:۱،ص:۹۸۔ سنن کبریٰ بیہقی، ج:۲،ص:۴۹۶)

## حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تراویح اور اس

سلسلہ میں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا ہے، اس کے متعلق سوال کیا تو آپؓ نے فرمایا: تراویح سنتِ مؤکدہ ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے ۲۰ رکعات مقرر و متعین نہیں کیں اور نہ وہ کسی بدعت کے ایجاد کرنے والے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جو ۲۰ کا حکم دیا ہے، اس کی آپ کے پاس ضرور کوئی اصل تھی اور ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سنت جاری کی اور لوگوں کو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر جمع کیا، پس انہوں نے تراویح کی جماعت کروائی، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کثیر تعداد میں موجود تھے۔ حضرت عثمانؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، عباسؓ، ابن عباسؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، معاذؓ، اُبیؓ اور دیگر مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم سب موجود تھے، مگر کسی نے بھی اس کو رد نہیں کیا، بلکہ سب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موافقت کی اور اس کا حکم دیا۔
(اختلافِ اُمت اور صراطِ مستقیم، ص:۲۹۲، بحوالہ الاختیار لتعلیل المختار، ج:۱،ص:۶۸)

مندرجہ بالا روایات سے یہ باتیں سامنے آئیں:

۱:......حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے تراویح میں ایک امام کے پیچھے لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ جمع کیا، کیونکہ اب تراویح کے فرض ہونے کا خدشہ ختم ہو گیا تھا۔

۲:......حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس امام کو بیس رکعت پڑھانے کا حکم دیا۔

۳:......حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیس رکعت تراویح کے ساتھ ۳ رکعت وتر بھی پڑھائے جاتے تھے۔

۴:......حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل اور امر پر کسی ایک بھی صحابیؓ کا انکار ثابت نہیں ہے۔

۵:...... امامت اُقرء الامۃ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کراتے تھے، ان سے بھی انکار ثابت نہیں۔ وہ بھی بیس رکعت ہی پڑھاتے رہے۔

۶:......کسی کا انکار نہ کرنا بمنزلہ اجماع کے ہوگیا، یعنی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیس رکعت پر اجماع ہوگیا۔

## عہدِ عثمانی

حضرت سائب بن یزید سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں رمضان کے اندر بیس رکعت تراویح کا اہتمام تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کرتے تھے اور ۱۰۰، ۱۰۰ آیات والی سورتیں پڑھا کرتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں شدتِ قیام اور طولِ قیام کی وجہ سے لوگ اپنی لاٹھیوں کو سہارا بھی بنالیا کرتے تھے۔ (سنن کبریٰ، ج:۲،ص:۴۹۶)

گویا حضرت امیر عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی بیس رکعت پڑھی جاتی تھیں، اگر بیس رکعت نہ

پڑھی جاتیں تو راوی اس کو ضرور نقل کرتے۔

## عہدِ مرتضوی

ا:......حضرت عبدالرحمٰن السلمی فرماتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ رمضان کے اندر قاریوں کو بلاتے، پھر ان میں سے ایک کو بیس رکعت تراویح کے لیے لوگوں کی امامت کا حکم فرماتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ (خود) لوگوں کو وتر پڑھاتے تھے۔ (سنن کبریٰ، ج:۲،ص:۴۹۶)

۲:......حضرت ابوالحسناء فرماتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو پانچ ترویحے یعنی بیس رکعت تراویح پڑھایا کرے۔ (سنن کبریٰ، ج:۲،ص:۴۹۶ ومصنف ابن ابی شیبہ، ج:۲،ص:۳۹۳)

## حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: حضرت جابرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہم تراویح جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ (المغنی لابن قدامہ، ج:۲،ص:۱۶۸)

حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل اور ان کے دور میں بیس رکعت تراویح کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں، اب جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ملاحظہ کریں:

## جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

ا:......حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۴ھ) فرماتے ہیں کہ: میں نے لوگوں (صحابہؓ و تابعینؒ) کو بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھتے ہی پایا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۲،ص:۳۹۳)

۲:......حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ لوگوں کو رمضان میں مدینہ منورہ میں بیس تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے۔ (ایضاً)

## حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

اَفقہ الامۃ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رمضان میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھتے تھے۔ (مختصر قیام اللیل للمروزی، ص:۱۵۷)

## ۲۰ رکعات تراویح پر اجماع صحابہؓ

ا:......علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جو ہوا فقہاء نے اجماع کی طرح شمار کیا۔ (ارشاد الساری لشرح البخاری، ج:۳،ص:۵۱۵)

۲:......مشہور محدث حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس بات

پر اجماع ہے کہ تراویح بیس رکعت ہیں۔ (مرقاۃ المفاتیح، ج:۳،ص:۱۹۴)

۳:......''فصار إجماعًا الخ ''کہ تراویح بیس رکعت ہونے پر اجماع ہوگیا۔(شرح النقایہ، ج:۲،ص:۲۴۱)

## مذاہبِ ائمہ اربعہؒ

اہل سنت والجماعت کے یہ چاروں مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) بھی اس بات پر متفق ہیں کہ تراویح ۲۰ رکعت سے کم نہیں ہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس پر چند حوالہ جات اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کردوں، مگر مضمون کافی طویل ہوتا جارہا ہے، اس لیے صرف ایک حوالہ علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا پیش کرتا ہوں، فرماتے ہیں: ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک سے بھی بیس رکعت تراویح سے کم کا قول منقول نہیں اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب تھا۔ (العرف الشذی،ص:۳۰۸،بحوالہ خزائن السنن، حصہ سوئم،ص:۳۴)

## امام ترمذیؒ کا ارشاد

''وأکثر اهل العلم على ماروي عن علي وعمر وغيرهما من أصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم عشرين ركعة وهو قول سفيان و ابن المبارک والشافعي وقال الشافعي: وهكذا أدركت ببلدنا بمكة يصلون عشرين ركعة۔'' (سنن ترمذی، ج:۱،ص:۹۹)

''اکثر اہلِ علم بیس رکعت کے قائل ہیں جیسا کہ حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارکؒ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: میں نے اپنے شہر مکہ مکرمہ میں لوگوں کو بیس رکعت پڑھتے ہی پایا ہے۔''

## شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ قدس سرہٗ کا فرمان

''قد ثبت أن أبي بن كعب كان يقوم بالناس عشرين ركعة في رمضان ويوتر بثلٰث فرأى كثير من العلماء أن ذٰلک هو السنة لأنهٗ قام بين المهاجرين والأنصار ولم ينكره منكر۔'' (فتاویٰ ابن تیمیہ، ج:۲۳،ص:۱۱۲)

''یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ لوگوں (صحابہؓ و تابعینؒ) کو رمضان المبارک میں بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے، پس بہت سارے علماء نے اسی کو سنت قرار دیا ہے، کیونکہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیس رکعتیں حضرات انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں پڑھائی تھیں اور کسی نے انکار نہیں کیا۔''

دیکھئے! علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے انسان جن کا تشدد مشہور ہے، بیس رکعت کو ''بدعت'' نہیں

''سنت'' کہہ رہے ہیں ۔

## بیس رکعت تراویح کی حکمت

علامہ محمد یوسف لدھیانوی شہید قدس سرہٗ نے بیس رکعت تراویح کی حکمتیں بیان کرتے ہوئے تین حوالہ جات نقل فرمائے ہیں، اختصار کے پیشِ نظر ہم ان کا صرف ترجمہ نقل کرتے ہیں:

۱:...... علامہ حلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ: ''تراویح کے بیس رکعات ہونے میں حکمت یہ ہے کہ سنن، فرائض اور واجبات کی تکمیل کے لیے مشروع ہوئی ہیں اور فرائضِ پنجگانہ وتر سمیت بیس رکعات ہیں، لہٰذا تراویح بھی بیس رکعات ہوئیں، تاکہ ''مُکمَّل'' اور ''مُکمِّل'' کے درمیان مساوات ہو جائے ۔'' (البحر الرائق، ج:۲،ص:۷۲)

۲:...... علامہ منصور بن یونس حنبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اور بیس تراویح میں حکمت یہ ہے کہ سنن مؤکدہ دس ہیں ۔ (۲ صبح کی، ۴ قبل الظہر، ۲ بعد الظہر، ۲ بعد المغرب) پس رمضان میں ان کو دوچند کر دیا گیا، کیونکہ وہ محنت و ریاضت کا وقت ہے ۔'' (کشف القناع عن متن الاقناع، ج:۱،ص:۳۹۲)

۳:...... حکیم الامت حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس امر کو ذکر کرتے ہوئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تراویح کی بیس رکعتیں قرار دیں، اس کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں: ''اور یہ اس لیے کہ انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسنین کے لیے (صلوٰۃ اللیل) گیارہ رکعتیں پورے سال میں مشروع فرمائی ہیں، پس ان کا فیصلہ یہ ہوا کہ رمضان مبارک میں جب مسلمان تشبہ بالملکوت کے دریا میں غوطہ لگانے کا قصد رکھتا ہے تو اس کا حصہ سال بھر کی رکعتوں کے دوگنا سے کم نہیں ہونا چاہیے ۔'' (حجۃ اللہ البالغہ، ج:۲،ص:۸، بحوالہ اختلاف امت اور صراطِ مستقیم، ج:۲،ص:۲۹۴)

ناظرین باتمکین! آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ سے لے کر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانۂ مبارکہ اور سلفِ صالحین کے دور میں تراویح بیس رکعت ہی پڑھی پڑھائی جاتی تھیں اور کوئی ایک بھی نہ اس کا منکر رہا اور نہ اس کے بدعت ہونے کا کسی نے فتویٰ دیا، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اور خلیفہ راشد خود روایت کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ: ''جس نے بدعت ایجاد کی اس کا نہ فرض قبول ہے، نہ نفل ۔'' (بخاری، ج:۲،ص:۱۰۸۴)

وہ بھی اور تمام انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم بیس رکعت کو پڑھتے پڑھاتے ہیں، اگر بیس رکعت تراویح بدعت ہوتی (جیسا کہ غیر مقلدین حضرات کا فتویٰ ہے) تو کیا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو معیارِ ایمان ہیں، وہ اس پر عمل کرتے؟! حاشا وکلا ہرگز نہیں، ہرگز نہیں ۔

## تراویح کے آٹھ ہونے کا سب سے پہلا فتویٰ اور اس کا جواب

امام اہلِ سنت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''ہماری دانست کے مطابق خطۂ پنجاب میں سب سے پہلے جن صاحب نے تراویح کے آٹھ ہونے کا فتویٰ دیا ہے، وہ مولوی مفتی محمد حسین صاحب بٹالوی گورداسپوری ہیں۔

پھر آگے فرماتے ہیں: ''جو اس علاقہ کے غیر مقلدین حضرات کے روحِ رواں تصور ہوتے تھے۔ ان کے فتوے کا جواب اگر کوئی حنفی یا مقلد عالم دیتا تو باوجود معقول اور درست ہونے کے کہنے والے اس کو تعصب کی پیداوار کہہ کر دیتے، لیکن پروردگار نے یہ کام ایک اہل حدیث اور غیر مقلد عالم سے لیا، یعنی حضرت مولانا غلام رسول صاحب قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ۔'' (رسالہ تراویح، ص:۸)

چنانچہ مولوی محمد حسین بٹالوی کے جواب میں مولانا غلام رسول صاحب نے ایک رسالہ لکھا: ''رسالۂ تراویح'' اور اس میں بٹالوی صاحب کے آٹھ رکعت تراویح والے فتوے کا علمی اور تحقیقی طور پر خوب رد کیا اور اس بے بنیاد فتوے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور بٹالوی صاحب کو ''غالی'' کا لقب دیا۔

عجیب بات: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل تو بدعت نظر آ گیا، مگر بارہ سو سال بعد والے مولوی کا فتویٰ عین سنت۔ ایں چہ بوالعجبی است

## آٹھ رکعت کے قائلین کی دلیل اور اس کے جوابات

''عَنْ أَبِيْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَنَّهٗ سَأَلَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا كَيْفَ كَانَتْ صَلوٰةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ رَمَضَانَ ؟ فَقَالَتْ: مَاكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلَافِيْ غَيْرِهٖ عَلٰى إِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً يُصَلِّيْ أَرْبَعًا فَلا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّيْ أَرْبَعًا فَلا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّيْ ثَلاثًا. قَالَتْ عَائِشَةُ: فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوْتِرَ؟ فَقَالَ: يَاعَائِشَةُ ! إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَايَنَامُ قَلْبِيْ۔''

''حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کی رمضان میں نماز کی کیا کیفیت ہوا کرتی تھی؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: اللہ کے رسول رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ آپ ﷺ پہلے چار رکعت ادا فرماتے تھے، پس ان کی خوبی اور لمبائی کے بارے میں مت پوچھ (کہ وہ کتنی لمبی اور خوب ہوا کرتی تھیں) پھر آپ ﷺ چار رکعت اسی طرح پڑھا کرتے تھے۔ پھر تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے

عرض کیا کہ: آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوجاتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔'' (بخاری، ج:۱،ص:۱۵۴۔مسلم، ج:۱،ص:۲۵۴)

غیرمقلدین حضرات مذکورہ بالا حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ تراویح آٹھ ہیں:

الجواب: حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

''خود غیرمقلدین کا بھی اس حدیث پر عمل نہیں۔ یہاں غیر رمضان کا لفظ ہے، وہ غیرمقلدین غیررمضان (رمضان کے علاوہ) میں تراویح نہیں پڑھتے۔ یہاں چار چار رکعت کا ذکر ہے، وہ دو دو پڑھتے ہیں۔ یہاں گھر میں نماز کا ذکر ہے، وہ مسجد میں پڑھتے ہیں۔ یہاں تین وتر کا ذکر ہے، وہ ایک پڑھتے ہیں۔ یہاں بلا جماعت نماز کا ذکر ہے، وہ باجماعت پڑھتے ہیں۔ یہاں وتر سے پہلے سونے کا ذکر ہے، وہ وتر سے پہلے نہیں سوتے۔'' (تجلیاتِ صفدر، ج:۳،ص:۳۳۳)

دراصل اس حدیث کا تعلق تہجد سے ہے، لیکن ان حضرات نے اس کو تراویح پر بھی فٹ کردیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کو روایت کرنے والی ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ ہیں، جن کی وفات ۵۷ھ میں ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کی جماعت ۱۵ھ میں شروع کرائی، بقول حضرت مولانا اوکاڑویؒ:

''پورے بیالیس سال اماں جانؓ کے حجرہ کے ساتھ متصل مسجدِ نبوی میں ۲۰ رکعت تراویح کی بدعت جاری رہی، اماں جان خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث روایت فرماتی ہیں کہ: جس نے اس دین میں بدعت جاری کی وہ مردود ہے۔ (بخاری، مسلم) مگر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اماں جانؓ نے بیالیس سال میں ایک دفعہ بھی اس تہجد والی حدیث کو بیس تراویح والوں کے خلاف پیش فرمایا ہو۔ اب دو ہی راستے ہیں: یا تو یہ مان لیا جائے کہ اس حدیث کا تراویح سے کوئی تعلق نہیں، اماں جان یہی سمجھتی تھیں، یا یہ مان لیا جائے کہ اس حدیث کو بیس تراویح کے خلاف ہی سمجھتی تھیں، لیکن ان کے دل میں سنت کی محبت اور بدعت سے نفرت اتنی بھی نہ تھی جتنی آج کل کے ان پڑھ غیرمقلدین میں ہے۔ یہ تو رافضی ہی کی سوچ ہوسکتی ہے۔'' (تجلیاتِ صفدر، ج:۳،ص:۲۷۲،۲۷۳)

اور بھی کئی جوابات دیئے گئے ہیں، باذوق حضرات ان کو خزائن السنن، ج:۱، حصہ سوم، درسِ ترمذی، ج:۲، تجلیاتِ صفدر، ج:۳، حدیث اور اہل حدیث، مجموعہ مقالات، نماز مسنون وغیرہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

## ایک نظر اِدھر بھی

سعودی عرب کے نامور عالم مسجدِ نبوی کے مشہور مدرس اور مدینہ منورہ کے (سابق) قاضی الشیخ عطیہ محمد سالم رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۹۹ء) نے نمازِ تراویح کی چودہ سو سالہ تاریخ پر عربی زبان میں ایک مستقل کتاب (التراويح أكثر من ألف عامٍ في المسجد النبوي) لکھی ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں تصنیف کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: مسجدِ نبوی میں نمازِ تراویح ہو رہی ہوتی ہے تو بعض لوگ آٹھ رکعت پڑھ کر ہی رک جاتے ہیں، ان کا یہ گمان ہے کہ آٹھ رکعت تراویح پڑھنا بہتر ہے اور اس سے زیادہ جائز نہیں ہے، اس طرح یہ لوگ مسجدِ نبوی میں بقیہ تراویح کے ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی اس محرومی کو دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے، لہٰذا میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں، تاکہ ان لوگوں کے شکوک وشبہات ختم ہوں اور ان کو بیس رکعت تراویح پڑھنے کی توفیق ہو جائے۔ اس کتاب میں ۱۴۰۰ سالہ تاریخ پر مدلل بحث کرنے کے بعد شیخ عطیہ محمد سالم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اس تفصیلی تجزیہ کے بعد ہم اپنے قُراء سے اولاً تو یہ پوچھنا چاہیں گے کہ کیا ایک ہزار سال سے زائد اس طویل عرصہ میں کسی ایک موقع پر بھی یہ ثابت ہے کہ مسجدِ نبوی میں مستقل آٹھ رکعت تراویح پڑھی جاتی تھیں؟ یا چلیں بیس سے کم تراویح پڑھنا ہی ثابت ہو؟ بلکہ ثابت تو یہ ہے کہ پورے چودہ سو سالہ دور میں بیس یا اس سے زائد ہی پڑھی جاتی تھیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کسی صحابیؓ یا ماضی کے کسی ایک عالم نے بھی یہ فتویٰ دیا کہ ۸ سے زائد تراویح جائز نہیں ہیں اور اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو اس فتوے کی بنیاد بنایا ہو؟۔'' (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ص: ۴۸، بابت ماہ جولائی اگست، ۲۰۱۳ء)

## خلاصۂ بحث

تیرہ صدیوں تک سلفِ صالحین میں سے کوئی ایک بھی ۸ رکعت تراویح کا قائل نہیں تھا اور نہ کسی نے پڑھی اور نہ ہی بیس رکعت پر کسی نے نکیر فرمائی۔ تیرہویں صدی ۱۲۸۴ء میں ایک غیر مقلد عالم نے ۸ رکعت کا فتویٰ جاری کیا، اس وقت سے آج تک کہیں بھی چاہے حرمین شریفین ہوں یا کوئی اور جگہ غیر مقلدین کے سوا کوئی بھی آٹھ کا قائل نہیں ہے۔ حرمین شریفین میں شروع سے آج تک ۲۰ رکعت تراویح ہی پڑھی پڑھائی جارہی ہیں، والحمد للہ علی ذالک.

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ....

# علومِ حدیث میں تصانیف کا آغاز!

مولانا شایان احمد
متخصص علومِ حدیث، جامعہ

قرآن مجید دینِ اسلام کی اَساس اور بنیاد ہے اور اسی محکم بنیاد پر اسلام کی خوبصورت اور بلند و بالا عمارت مستوی ہے اور یہی وہ کتابِ سماوی ہے جو تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی، ارشادِ ربانی ہے:

''إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ أَقْوَمُ.'' (بنی اسرائیل:۹)

ترجمہ: ''یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے۔''

جن لوگوں نے قرآنی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنایا، وہ کبھی تاریک راہوں میں نہ بھٹکے اور قرآن مجید نے انہیں ''إِنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيْرًا'' کا مژدہ سنایا۔ مسلمانوں کی جمعیت نے جب قرآنی احکامات کی پاسداری کی تو اللہ رب العزت نے انہیں ''لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ'' کے نقد انعام سے نوازا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت جو اسلام سے پہلے جہالت کی اَتھاہ گہرائیوں میں تھی اور ان پر کوئی حکومت کرنا پسند نہ کرتا تھا، قرآنی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے بعد دنیا میں اللہ کی رضا کا پروانہ حاصل کیا اور ماسوا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے تمام انسانوں سے افضل قرار پائے۔ قرآن مجید کی وضاحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے اور اس کے بغیر منشأ خداوندی کو سمجھنا محال ہے: ''أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ''......... ''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' گویا تعلیم کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارِ نبوت کا ایک جزء تھا، تعلیم کتاب بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وفعل وحیِ الٰہی تھا: ''إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى.'' لہٰذا فہمِ قرآن کا مدار فہمِ حدیث پر ہوا اور فہمِ حدیث گویا فہمِ قرآن کے لیے ناگزیر ہے۔ یہی علوم (قرآن وحدیث) علمِ شریعت کی بنیاد کہلائے اور طالبینِ علوم کی نظر ہمیشہ سے انہی علومِ عالیہ پر رہی، قرنِ اول سے ہی لوگوں نے ان دونوں علوم کی خدمت کو سعادت سمجھا اور اس بحرِ ذخار میں غوطہ زن ہوکر گوہرِ نایاب اُمت کے سامنے رکھ دیئے اور اپنی عمرِ عزیز کو اس علم کی جستجو میں فنا کرتے رہے۔

علومِ قرآن وحدیث اپنی وسعت کی وجہ سے کئی شعبوں میں منقسم ہوگئے اور ہر شعبے میں انہیں ایسے رجال کارمہیا ہوگئے، جنہوں نے اس کی تدوین وتبویب کی اور ہر فن کو دوسرے فن سے ممتاز کیا۔ علومِ حدیث کی وسعت کے لیے چھٹی صدی ہجری کے محدث وفقیہ، امام ابوبکر زین الدین حازمیؒ کے فرمان پر نگاہ ڈالیے:

’’علم الحديث يشمل على أنواع كثيرة، تقرب من مائة نوع، ذكر منها أبو عبد الله الحاكم في معرفة علوم الحديث.‘‘ (عجالۃ المبتدی وفضالۃ المنتہی للحازمی، ص:۳، المطبعۃ الامیریۃ)

’’علمِ حدیث کی سو کے لگ بھگ انواع ہیں، ابوعبداللہ حاکمؒ نے اپنی کتاب ’’معرفة علوم الحديث‘‘ میں ان انواع میں سے معتد بہ ذکر کی ہیں۔‘‘

امام ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ میں پینسٹھ (۶۵) انواع ذکر کی ہیں، جبکہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر کتب سے جمع کرکے اپنے اضافات کے ساتھ ’’تدريب الراوي‘‘ میں چورانوے (۹۴) انواع ذکر کی ہیں۔ یہ ساری انواع بعد کے لوگوں کی اختراع کردہ نہیں، بلکہ قرونِ اولیٰ میں علومِ حدیث کی بعض انواع کا وجود ملتا ہے، جس پر اس مضمون میں روشنی ڈالی جائے گی کہ علمِ حدیث میں تصانیف کی ابتداء کب سے ہوئی؟

علمِ حدیث کی خدمت تو عہدِ نبوی سے ہی شروع ہوچکی تھی، لیکن عرب چونکہ حافظہ کی مدد سے علم کو باقی رکھتے تھے، لہٰذا پہلی صدی ہجری میں کتابت کا کچھ خاص اہتمام نہ تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا خیال اس طرف گیا کہ اگر اسی طرح حافظہ پر اعتماد رہا تو رفتہ رفتہ اس میں انحطاط آجائے گا اور یہ علوم ضائع ہوجائیں گے، لہٰذا انہوں نے ابن شہاب زہریؒ کو کتابتِ حدیث کا حکم فرمایا، اس سے پہلے کتابت کا رواج جو خال خال تھا، اس نے زور پکڑا اور نقوشِ ذہنیہ صفحۂ قرطاس پر آنے لگے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے شرح نخبہ میں فرمایا:

’’فمِنْ أوَّلِ مَنْ صَنَّفَ في ذلک القاضي أبو محمد الرامهرمزيّ كتابه المحدث الفاصل.‘‘

حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق ابو محمد رامہرمزی رحمۃ اللہ علیہ اول مصنفین میں سے ہیں اور ان کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی، گویا علمِ حدیث چوتھی صدی ہجری میں مرتب ہوا۔ حافظؒ کے اس کلام پر مضمون کے آخر میں تفصیلی روشنی ڈالیں گے کہ حافظؒ کے کلام کا کیا مطلب ہے؟ اور شراح نے اس کی کیا توجیہات فرمائی ہیں! سرِدست یہ دیکھنا ہے کہ علومِ حدیث میں تصانیف کا آغاز کب ہوا؟!

امام حاکم نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ’’معرفة علوم الحديث‘‘ میں ’’النوع العشرين‘‘ کے تحت متقدمینِ فن کا ذکر فرمایا ہے اور انہی اساطینِ علم میں علی بن المديني رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ نیز اصولِ حدیث میں ان کی تصنیفاتِ کثیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، ان کی تصنیفات کے ذکر سے قبل ان کے مختصر حالات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ علومِ حدیث میں ان کا تقدُّم اور جلالتِ شان معلوم ہوسکے۔

# مختصر احوال علی ابن المدینی رحمۃ اللہ علیہ

## نام وکنیت اور ولادت باسعادت

آپ کی کنیت ابوالحسن اور مکمل نسب اس طرح ہے: علی بن عبد اللہ بن جعفر بن نجیح بن بکر بن سعد السعدی، المعروف بابن المدینیؒ ۔علی بن المدینیؒ بصرہ میں ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔

## اساتذۂ علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ

علی بن المدینیؒ کے اساتذہ میں سے: ان کے والد عبد اللہ بن جعفر (۱۷۸ھ)، حماد بن زید (۹۸-۱۷۹ھ) جعفر بن سلیمان (۱۷۸ھ)، یزید بن زریع (۱۰۱-۱۸۲ھ)، عبد العزیز الدراوردی (۱۸۷ھ) معتمر ابن سلیمان (۱۰۶-۱۸۷ھ)، سفیان بن عیینہ (۱۰۷-۱۹۸ھ)، جریر بن عبد الحمید (۱۸۸ھ)، غندر (۲۹۴ھ)، حاتم بن وردان (۱۸۴ھ)، عبد العزیز بن ابی حازم (۱۸۴ھ)، معاویہ بن عبد الکریم (۱۸۰ھ)، یوسف ابن الماجشون (۱۸۵ھ)، عبد الوہاب ثقفی (۱۹۴ھ)، ہشام بن یوسف (۱۹۷ھ)، عبد الرزاق (۱۲۶-۲۱۱ھ) اور ان کے علاوہ بہت سے اساطینِ علم وفضل داخل ہیں۔

امام ابن مدینیؒ نے ان اساتذہ سے علم حاصل کیا اور اس میں وصفِ کمال کو پہنچے اور اس شان میں ممتاز ہوئے اور تصانیف فرمائیں اور احادیث کو جمع کیا۔ کہا گیا ہے کہ: ''ان کی تصانیف دوسو (۲۰۰) کے لگ بھگ ہیں۔'' امام ابن مدینیؒ کا حلقۂ تلامیذ بھی بہت وسیع ہے، بڑے بڑے محدثین نے آپ سے روایات بیان فرمائی ہیں۔

## تلامذہ علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ

آپ سے جنہوں نے روایت کی ہے ان میں سے: احمد بن حنبل (۱۶۴-۲۴۱ھ)، ابویحییٰ صاعقہ (۱۸۵-۲۵۵ھ)، زعفرانی (۲۶۰ھ)، ابوبکر صاغانی (۲۷۰ھ)، ابوعبد اللہ بخاری (۱۹۴-۲۵۶ھ)، ابوحاتم (۱۹۵-۲۷۷ھ)، حنبل بن اسحاق (۲۷۳ھ)، محمد بن یحییٰ (۱۷۲-۲۵۸ھ)، ابوداوٗد (۲۷۵ھ)، حمید بن زنجویہ (۲۵۱ھ)، حسن البزار (۲۴۹ھ)، ابوداوٗد الحرانی (۲۷۲ھ)، ابویعلی موصلی (۲۱۱-۳۰۷ھ)، ابوالقاسم بغوی وغیرہم شامل ہیں۔ان کے علاوہ آپ کے شیخ سفیان بن عیینہؒ نے بھی آپ سے روایات نقل کی ہیں۔

## ابن مدینی رحمۃ اللہ علیہ سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ آپ کے شیخ تھے، آپ کا بہت ادب فرماتے اور نہایت تعظیم سے پیش آتے تھے۔مسلم ابن علان اپنی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت سفیان بن عیینہؒ

نے علی بن المدینیؒ کے واسطے سے حدیث بیان فرمائی اور پھر فرمایا: تم لوگ مجھے علی بن المدینی کی محبت کے بارے میں ملامت کرتے ہو، اللہ کی قسم! میں نے علی سے اس سے زیادہ استفادہ کیا ہے جتنا استفادہ اس نے مجھ سے کیا ہے۔ ابن عیینہؒ فرماتے ہیں: میں تمہاری مجلس میں بیٹھنے کا مشتاق نہیں ہوں، اگر علی بن المدینی نہ ہوتے تو میں تمہاری مجلس میں نہ بیٹھتا۔ خلف ابن ولید جوہری (۲۱۲ھ) فرماتے ہیں: ایک دن ابن عیینہؒ ہمارے پاس آئے اور علی بن المدینی ہمارے پاس تشریف فرما تھے، تو ابن عیینہؒ نے فرمایا: اگر علی ابن المدینی نہ ہوتے تو میں تمہارے پاس نہ آتا۔

## علی ابن مدینیؒ دیگر اساطین علم کی نظر میں

ابوحاتم رازیؒ (۲۷۷ھ) کا ارشاد ہے: علی ابن المدینیؒ معرفتِ حدیث اور معرفتِ علل میں سب لوگوں سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ، علی ابن المدینی کا نام نہیں لیا کرتے تھے، بلکہ آپ کی عظمت کی وجہ سے آپ کی کنیت بیان کرتے تھے۔ ابراہیم ابن معقلؒ (۲۹۵ھ) نے فرمایا: میں نے امام بخاریؒ سے سنا وہ فرمار ہے تھے: میں اپنے آپ کو کسی کے سامنے چھوٹا خیال نہیں کرتا سوائے علی ابن المدینی کے۔

امام بخاریؒ سے منقول ہے، ان سے پوچھا گیا: آپ کس بات کی تمنا رکھتے ہیں؟ امام بخاریؒ نے فرمایا: کہ میں عراق جاؤں اور علی بن المدینی بقیدِ حیات ہوں اور میں ان کی مجلس میں شرکت کروں۔

ابوعبیدہ آجریؒ فرماتے ہیں، ابوداؤد سے پوچھا گیا: احمد بن حنبل زیادہ علم والے ہیں یا پھر علی ابن المدینی؟ آپ نے فرمایا: علی ابن المدینی اختلافِ حدیث میں امام احمد سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔

## انتقالِ پُر ملال

امام علی ابن المدینیؒ کی وفات ۲۳۴ ہجری کو مقام سامرّاء میں ہوئی۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں: ۲۸ ذیقعدہ کو ۲۳۴ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ (سیر اعلام النبلاء للذہبی، ج:۱۱، ص:۴۱، ط:مؤسسۃ الرسالۃ)

علی بن المدینیؒ کے ترجمہ سے مقصود اُن کی جلالتِ شان وعلوِ مرتبت کا بیان تھا کہ دوسری صدی کے عظیم المرتبت محدث نے علومِ حدیث پر قلم اُٹھایا تو ایسی تصانیف چھوڑیں کہ بعد کے علماء اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتے اور ہر دور میں علمائے حدیث ان کے خوشہ چین رہے۔ ذیل میں علی ابن المدینیؒ کی تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے، جس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجائے گی کہ علومِ حدیث میں تصانیف کا آغاز کب سے ہوا؟

حاکمؒ نے ''**معرفة علوم الحديث**'' میں اور امام ذہبیؒ نے ''**سير أعلام النبلاء**'' میں علی بن المدینی کی ۲۶ کتب کا ذکر کیا ہے۔

## تصانیف علی بن المدینیؒ

۱:-''الاسماء والکنی ''(۸)اجزاء ۲:-''الضعفاء ''(۱۰)اجزاء
۳:-''المدلسون ''(۵)اجزاء ۴:-''اول من فصح عن الرجال ''(۱)جزء
۵:-''الطبقات ''(۱۰)اجزاء ۶:-''من روی عمن لم یرہ''(۱)جزء
۷:-''علل المسند ''(۳۰)اجزاء ۸:-''العلل من روایة إسماعیل القاضي ''(۱۴)اجزاء
۹:-''التاریخ ''(۱۰)اجزاء ۱۰:-''علل حدیث ابن عیینة ''(۱۳)اجزاء
۱۱:-''من لایحتج به ولا یسقط ''(۲)اجزاء ۱۲:-''من نزل من الصحابةؓ النواحي''(۵)اجزاء
۱۳:-''العرض علی المحدث ''(۵)اجزاء ۱۴:-''من حدث ورجع عنه ''(۲)اجزاء
۱۵:-''سؤالات یحییٰ القطان ''(۲)اجزاء ۱۶:-''سؤال یحییٰ وابن مهدي عن الرجال ''(۵)اجزاء
۱۷:-''الأسانید الشاذة ''(۲)اجزاء ۱۸:-''الثقات ''(۱۰)اجزاء
۱۹:-''اختلاف الحدیث ''(۵)اجزاء ۲۰:-''الأشربة ''(۳)اجزاء
۲۱:-''الغریب''(۵)اجزاء ۲۲:-''الإخوة والأخوات''(۳)اجزاء
۲۳:-''من عرف بغیر اسم أبیه ''(۲)اجزاء ۲۴:-''من عرف بلقبهٖ''(۱)جزء
۲۵:-''العلل المتفرقة ''(۳۰)اجزاء ۲۶:-''مذاهب المحدثین''(۲)اجزاء

(سیر اعلام النبلاء للذہبی، ترجمہ علی ابن المدینی، ج:۱۱ص:۶۰، ط:مؤسسۃ الرسالۃ۔ معرفۃ علوم الحدیث للحاکم، النوع العشرون، ص:۷۱، ط:دار الکتب المصریہ)

## نتیجہ

امام علی ابن المدینیؒ کے احوال اور ان کی تصانیف سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ علومِ حدیث میں تصانیف کا آغاز علی ابن المدینیؒ کے ہاتھوں دوسری صدی کے اخیر میں ہوگیا تھا۔ اس سے معترضین کا وہ اعتراض بھی دور ہوگیا کہ علوم حدیث کی تدوین وتبویب علمائے متأخرین نے شروع کی۔ اس کے علاوہ جزوی اور ضمنی طور پر بھی محدثین ہمیشہ علومِ حدیث پر اجزاء لکھتے رہے، جیسے امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الرسالة'' میں ضمناً اہم مباحث ذکر فرمائے ہیں۔ امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کی ابتداء میں علومِ حدیث پر جاندار مقدمہ تحریر فرمایا۔ امام ترمذیؒ نے سنن کے آخر میں ''کتاب العلل '' کی صورت میں پر مغز رسالہ لکھا، غرض یہ کہ متقدمین نے قرونِ اولیٰ میں کسی بھی طرح اس علم سے بے اعتنائی نہیں فرمائی۔

## حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا جائزہ

ابتدائے مضمون میں حافظؒ کے کلام کا اجمالی ذکر تھا کہ انہوں نے ''شرح نخبة الفکر ''میں ''فمِنْ أوَّلِ مَنْ صَنَّفَ في ذٰلک القاضي أبو محمد الرامهرمزيّ کتابَه المحدث الفاصل '' سے علم حدیث میں

اول تصانیف کا ذکر کیا ہے ۔ ( شرح نخبۃ الفکر لابن حجرؒ ص: ۳۸، ط: مکتبۃ البشریٰ )

ماقبل کے بیان سے معلوم ہوا کہ علومِ حدیث میں تصانیف کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہو چکا تھا اور اس سلسلہ میں علی ابن المدینیؒ کی چند کتب کے اسماء بھی ذکر کر دیئے گئے ، جبکہ ابو محمد الرامہرمزیؒ ( ۳۶۰ھ ) چوتھی صدی کے بزرگ ہیں تو حافظؒ کی اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟

## حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے متعلق ملا علی قاریؒ کی تشریح

**پہلا مطلب:....** ملا علی قاریؒ نے شرح نخبہ میں حافظؒ کی عبارت کی توضیح اس طرح فرمائی کہ ''مِــــنْ أَوَّلِ '' میں ''مِــنْ '' تبعیضیہ ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ ابو محمد رامہرمزی اوائل مصنفین میں سے ہیں ، نہ کہ اول مصنف ہیں ۔ گویا ایک جماعت نے اس زمانے میں تصانیف کیں ، لیکن کوئی کسی پر سبقت نہ کر سکا ۔ ( شرح شرح النخبۃ لملاعلی قاری ، ص: ۱۳۷، ط: قدیمی ) ملا علی قاریؒ کی توضیح سے بھی قرونِ اولیٰ کی تصانیف پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ، بلکہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسی چوتھی صدی ہجری میں بہت سے لوگوں نے تصانیف کیں جن میں سے ایک رامہرمزیؒ بھی تھے ۔

**دوسرا مطلب:....** حافظؒ کے کلام کا ایک دوسرا مطلب ہے جسے اختیار کرنے کے بعد تمام اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے کہ اول تصانیف سے مراد اشہر تصانیف ہیں کہ جن مصنفین کی کتابوں کے اسماء گرامی حافظؒ نے ''شـرح الـــنخبة '' میں ذکر کیے ہیں ، وہ کتابیں مقبول بین الناس ہوئیں اور مشہور ہوئیں ، لہٰذا علومِ حدیث میں شہرت پانے کے اعتبار سے یہ اول تصانیف ہوئیں ۔

**تیسرا اور لطیف مطلب:....** حافظؒ کی اس عبارت کا ایک لطیف مطلب جسے دکتور محمود الطحان نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے ، وہ یہ کہ علومِ حدیث میں تصانیف کا آغاز تو قرونِ اولیٰ میں ہو چکا تھا ، لیکن ہر فن دوسرے فن میں منضم تھا اور ممتاز نہ تھا ، اصطلاحات مستقل نہ تھیں ، چوتھی صدی ہجری میں اس پر ترتیب سے کتابیں لکھی گئیں اور ہر فن کو دوسرے سے ممتاز کیا گیا ، گویا اس کی تنقیح چوتھی صدی ہجری میں ہوئی ۔ ( تیسیر مصطلح الحدیث ، مقدمۃ العلمیۃ ، ص: ۱۰، ط: مکتبۃ البشریٰ )

## خلاصۂ کلام

ساری تحریر کا لبِ لباب اور ثمرہ یہ ہے کہ علومِ حدیث میں تصانیف کا آغاز تو قرونِ اولیٰ میں علی ابن المدینیؒ کے ہاتھوں شروع ہوا اور چوتھی صدی ہجری میں اس کی تنقیح ہوئی اور کتابیں لکھی گئیں جو اطرافِ عالم میں مشہور ہوئیں ۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ....

# خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

مولانا عبدالمنان معاویہ
الہٰ آباد، لیاقت پور، ضلع رحیم یار خان

تاریخِ عالم نے ہزاروں جرنیل پیدا کیے، لیکن دنیا جہاں کے فاتحین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے طفلِ مکتب لگتے ہیں اور دنیا کے اہلِ انصاف سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدل پروری کو دیکھ کر جی کھول کر اُن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ: ''عمر (رضی اللہ عنہ) مرادِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔'' یعنی دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مُریدِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مرادِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ ایک عالم نے کیا خوب کہا کہ: ''عمرؓ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عطائے خداوندی تھے۔'' ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علمائے اسلام، حکمائے اسلام اور مستشرقین نے اپنے اپنے لفظوں میں بارگاہِ فاروقی میں عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا شمار مکہ مکرمہ کے چند پڑھے لکھوں میں ہوتا تھا، لیکن وہ بھی اسی عرب معاشرے کا حصہ تھے، جہاں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از نبوت صادق وامین کہا جاتا تھا اور بعد از اعلانِ نبوت نعوذ باللہ! ساحر، شاعر، کاہن، اور نجانے کیا کیا کہا گیا۔

اہلِ مکہ کے جبر وستم بہت بڑھ چکے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سرِعام تبلیغ تو در کنار؛ عبادت بھی نہیں کر سکتے تھے، چھپ کر دینِ اسلام کی تبلیغ وعبادت کی جاتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد اس وقت اُنتالیس تھی۔ ایک رات بیت اللہ کے سامنے عبادت کرتے ہوئے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار سے عجیب دعا کی، مانگی بھی تو عجب شئے مانگی۔ کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ دعا میں یہ بھی مانگا جاتا ہے، اسلام کی بڑھوتری کی دعا کی جاتی، اہلِ مکہ کے ایمان لانے کی دعا کی جاتی، دنیائے عالم میں اسلام کی اشاعت کی دعا کی جاتی یا اہلِ مکہ کے ظلم وستم کی بندش کے لیے ہاتھ اُٹھائے جاتے، لیکن میرے عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ: ''اے اللہ! عمرو ابن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے کسی کو اسلام کی عزت کا ذریعہ بنا۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں دو لوگوں کو نامزد کیا اور فیصلہ خدائے علام الغیوب پر چھوڑ دیا کہ اللہ! ان دونوں میں سے جو تجھے پسند ہو وہ دے دے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور اسباب کی دنیا میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا سبب یہ بنا کہ ایک روز تیغِ برہنہ لیے جا رہے تھے، راستہ میں بنوزہرہ سے تعلق رکھنے والا ایک شخص ملا، جس نے پوچھا کہ عمر! خیریت! کہاں کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے: محمد کو قتل کرنے جا رہا ہوں، اس نے نئے دین کا اعلان کر کے مکہ والوں میں تفریق کر دی ہے، کیوں نہ اس قصہ کو ہی ختم کر دوں۔ بنوزہرہ سے تعلق رکھنے والے شخص نے کہا کہ: عمر! اگر تم نے ایسا کیا تو کیا ''بنو ہاشم و بنوزہرہ'' تم سے انتقام نہیں لیں گے؟ کہنے لگے: لگتا ہے کہ تم بھی اس نئے دین میں شامل ہو چکے ہو، انہوں نے کہا کہ پھر پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو، تمہاری بہن و بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں۔

جلال میں نکلنے والا عمر سیدھا بہن کے گھر پہنچتا ہے، یہاں سیدنا خباب بن الارت رضی اللہ عنہ ان کے بہنوئی و بہن کو سورۂ طٰہٰ پڑھا رہے تھے، باہر سے آواز سنی اور دروازہ پر دستک دی، اندر سے پوچھا گیا کون؟ عمر! نام سنتے ہی سیدنا خباب رضی اللہ عنہ چھپ گئے، عمر نے آتے ہی پوچھا: تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے بات ٹالتے ہوئے کہا کہ: ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے، کہنے لگے: میں نے سنا ہے تم نئے دین میں شامل ہو گئے ہو؟ بہنوئی نے کہا کہ: عمر! وہ دین تیرے دین سے بہتر ہے، تو جس دین پر ہے یہ گمراہ راستہ ہے، بس سننا تھا کہ بہنوئی کو دے مارا زمین پر، بہن چھڑانے آئی تو اتنی زور سے اس کے چہرے پر طمانچہ رسید کیا کہ ان کے چہرے سے خون نکل آیا، بہن کے چہرے پہ خون دیکھ کر غصہ ٹھنڈا ہوا اور بہنوئی کو چھوڑ کر الگ ہو بیٹھے اور کہنے لگے کہ: اچھا! لاؤ، دکھاؤ، تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن نے کہا کہ: تم ابھی اس کلام کے آداب سے ناواقف ہو، اس کلامِ مقدس کے آداب ہیں، پہلے تم وضو کرو، پھر دکھاؤں گی، انہوں نے وضو کیا اور سورۂ طٰہٰ پڑھنی شروع کی، یہ پڑھتے جا رہے تھے اور کلامِ الٰہی کی تاثیر قلب کو متاثر کیے جا رہی تھی۔ خباب بن ارت رضی اللہ عنہ یہ منظر دیکھ کر باہر نکل آئے اور کہنے لگے: عمرؓ! کل رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی تھی کہ: ''**اللّٰھمّ أعزّ الإسلام بأحد الرجلین إمّا ابن ھشام وإمّا عمر بن الخطاب** '' اور ایک دوسری روایت میں الفاظ کچھ اس طرح سے ہیں کہ: ''**اللّٰھم أید الإسلام بأبي الحکم بن ھشام وبعمر بن الخطاب.** '' اے اللہ! عمرو بن ہشام یا عمر بن خطاب میں سے کسی کو اسلام کی عزت کا ذریعہ بنا، یا ان میں سے کسی ایک کے ذریعے اسلام کی تائید فرما'' اے عمر! میرے دل نے گواہی دی تھی کہ یہ دعائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عمر بن خطاب کے حق میں پوری ہوگی۔ اسی طرح کی ایک روایت سیدنا سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''**کان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا رأی عمر بن الخطاب أو أبا جھل بن ھشام قال: اللّٰھم اشدد دینک**

**بـأحبّهمـا إليـک** ’’یعنی جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمر بن خطاب یا ابوجہل کو دیکھتے تو رب العزت کے حضور دستِ دعا دراز کرتے ہوئے فرماتے: اے اللہ! ان دونوں میں سے جو تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، اس سے اپنے دین کو قوت عطا فرما۔ (طبقات ابن سعد)

سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ: اچھا! تو مجھے بتاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، انہوں نے بتایا کہ: صفا پہاڑی پر واقع ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں قیام پذیر ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ چل پڑے، دَرّے پر مقیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب دیکھا کہ عمرآ رہا ہے اور ہاتھ میں ننگی تلوار ہے، تو گھبرائے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا، وہیں اسداللہ ورسولہ سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی تھے، وہ فرمانے لگے: آنے دو، اگر ارادہ نیک ہے تو خیر ہے اور اگر ارادہ صحیح نہیں تو میں اس کی تلوار سے اس کا کام تمام کردوں گا۔

جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی جاری تھا، چند لمحوں بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ سے فرمایا: ’’اے عمر! تم کس چیز کا انتظار کررہے ہو؟ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم اسلام قبول کرو؟!۔‘‘ بس یہ سننا تھا کہ فوراً کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ اصحابِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کی خوشی میں اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ صحنِ کعبہ میں بیٹھے ہوئے کفار ومشرکین نے بھی سنا اور اس نعرے کی آواز سے وادیِ مکہ گونج اُٹھی۔ پھر نبی رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سینۂ مبارک پر دستِ اقدس رکھا اور دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ اخْرُجْ مَافِيْ صَدْرِہٖ مِنْ غِلٍّ وَأَیِّدْ لَہٗ إِیْمَانًا. ’’.....’’یا اللہ! اس کے سینے میں جو کچھ میل کچیل ہو وہ دور کردے اور اس کے بدلے ایمان سے اس کا سینہ بھر دے۔‘‘ (مستدرک للحاکم) قبولِ اسلام کے وقت بعض مؤرخین کے نزدیک آپ کی عمر تیس سال تھی اور بعض کہتے ہیں کہ عمر چھبیس سال تھی۔ مصر کے ایک بہت بڑے عالم مفسرِ قرآن جناب علامہ طنطاویؒ نے عجیب جملہ کہا ہے کہ: ’’حقیقت یہ ہے کہ عمرؓ اسی گھڑی پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کی تاریخی زندگی کا آغاز ہوا۔‘‘

مفسرِ قرآن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ’’**قال رسول اللّٰہ** صلی اللہ علیہ وسلم: **لما أسلم أتاني جبرائیل، فقال: استبشر أھل السماء بإسلام عمرؓ** ’’یعنی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ’’جبرئیلؑ میرے پاس آئے اور کہا کہ: آسمان والے عمرؓ کے قبولِ اسلام پر خوشیاں منا رہے ہیں۔‘‘ (مستدرک للحاکم وطبقات ابن سعد)

چند ہی لمحوں بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اے اللہ کے نبی! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب دیا، تو فرمانے لگے کہ: پھر چھپ کر عبادت کیوں کریں؟ چلیے خانہ کعبہ میں چل کر

عبادت کرتے ہیں، میں قربان جاؤں اپنے آقا ومولا صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ انہوں نے ایسے ہی عمرؓ کو نہیں مانگا تھا، بلکہ دوررس نگاہِ نبوت دیکھ رہی تھی کہ اسلام کو عزت وشوکت عمرؓ کے آنے سے ہی نصیب ہوگی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دوصفوں میں تقسیم کیا: ایک صف کے آگے اسد اللہ ورسولہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ چل رہے تھے اور دوسری صف کے آگے مرادِ رسولؐ، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عطائے خداوندی یعنی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ چل رہے تھے۔ مسلمان جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو کفارِ مکہ نے دیکھا، نظر پڑی حمزہؓ پر اور عمرؓ پر تو بڑے غمگین ہوئے، لیکن کس میں جرأت تھی کہ کوئی بولتا؟! اس دن سے مسلمانوں کے لیے تبلیغِ دین میں آسانی پیدا ہوئی اور یہی وہ دن تھا جب اللہ کے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: ''**إن اللّٰه جعل الحق علٰی لسان عمرؓ وقلبه وهو الفاروق فرّق اللّٰه به بين الحق والباطل.**'' ..... ''اللہ تعالیٰ نے سچ کو عمرؓ کے قلب ولسان پر جاری کردیا اور وہ فاروق ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ حق وباطل میں فرق کردیا ہے۔'' (طبقات ابن سعد)

جناب سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''**واللّٰــه مـا استطعنــا أن نصلّي عندالكعبة ظـاهـرين حتٰى أسـلم عمرؓ**'' ....''اللہ کی قسم! ہم کعبہ کے پاس کھلے بندوں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔'' (مستدرک للحاکم)

اسی طرح حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو اسلام کو غلبہ نصیب ہوا، اور ہم کھلے بندوں اسلام کی دعوت دینے لگے اور ہم حلقہ بنا کر بیت اللہ میں بیٹھتے تھے، ہم بیت اللہ کا طواف کرنے لگے اور اب ہم پر اگر کوئی زیادتی کرتا تو ہم اس سے بدلہ لیتے تھے۔

کچھ اسی قسم کے تأثرات فقیہ الامت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: ''عمرؓ کا اسلام قبول کرنا ہماری کھلی فتح تھی، اور عمرؓ کا ہجرت کرنا ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرتِ خاص تھی، اور آپؓ کی خلافت تو ہمارے لیے سراپا رحمت تھی، میں نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب ہم بیت اللہ کے قریب بھی نماز ادا نہیں کرسکتے تھے، لیکن جب عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو آپؓ نے کفار سے مقابلہ کیا، یہاں تک کہ وہ ہمیں نماز پڑھنے دینے لگے۔ (طبقات ابن سعد)

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شانِ رفیعہ میں چند فرامینِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتا ہوں۔

۱:- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

''اے ابن خطاب! اس ذات پاک کی قسم! جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، جس راستے پہ آپ کو چلتا ہوا شیطان پالیتا ہے وہ اس راستہ سے ہٹ جاتا ہے، وہ راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔'' (صحیح بخاری)

۲:-صحیح بخاری میں روایت ہے کہ: ''حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں: میں نے حالتِ خواب میں دودھ پیا، یہاں تک کہ میں اس سے سیر ہوگیا اور اس کی سیرابی کے آثار میرے ناخنوں میں نمایاں ہونے لگے، پھر میں نے وہ دودھ عمرؓ کو دے دیا، اصحابِ رسولؐ نے پوچھا: یارسول اللہ! اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''علم''۔

۳:-اسی طرح امام بخاریؒ نے ایک اور روایت بھی اپنی صحیح میں درج کی ہے کہ:

''سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: میں نیند میں تھا، میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ میرے سامنے پیش کیے جارہے ہیں اور انہوں نے قمیصیں پہنی ہوئی ہیں، کسی کی قمیص سینے تک اور کسی کی اس سے نیچے تک، اور پھر عمرؓ کو پیش کیا گیا، انہوں نے ایسی لمبی و کھلی قمیص پہنی ہوئی تھی کہ وہ زمین پر گھسٹتی جارہی تھی، اصحابِ رسول (ﷺ) نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''دین''۔

۴:-اسی طرح بڑی ہی مشہور و معروف حدیث نبوی ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔'' یعنی اگر سلسلۂ نبوت جاری رہتا تو سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی منصبِ نبوت سے سرفراز کیے جاتے۔

۵:-ایک حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ: ''رسول مکرم و معظم ﷺ نے فرمایا کہ: تم سے پہلے جو اُمم گزری ہیں ان میں مُحدَث ہوا کرتے تھے اور میری امت میں اگر کوئی مُحدَث ہے تو وہ عمرؓ ہے۔''

اسی حدیث مبارکہ میں لفظ ''مُحدَث'' کی تشریح میں صاحب فتح الباری علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ یوں تحریر فرماتے ہیں کہ:

**''المُحدَث المُلهَم وهو من ألقي في روعه شيء من قبل الملاء الأعلىٰ ومن يجرى الصواب علىٰ لسانه بغير قصد.''**

یعنی ''محدث وہ ہے جس کی طرف اللہ کی طرف سے الہام کیا جائے، ملاءِ اعلیٰ سے اس کے دل میں القاء کیا جائے اور بغیر کسی ارادہ وقصد کے جس کی زبان پر حق جاری کردیا جائے۔'' یعنی اس کی زبان سے حق بات ہی نکلے۔

۶:-ایک بار سیدنا عمر رضی اللہ عنہ شفیع اعظم نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عمرہ کی اجازت طلب کی تو نبی مکرم و معظم ﷺ نے فرمایا: ''یا أخي أشركنا في صالح دعاء ك ولا تنسنا'' ... ''اے میرے بھائی! اپنی نیک دعاؤں میں ہمیں بھی شریک کرنا اور بھول نہ جانا۔''

۷:-سلسلۂ احادیث سے آخری حدیث پیش کرتا ہوں کہ یہ سلسلہ بہت دراز ہے اور دامنِ

صفحات میں جگہ کم ، بخاری شریف میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ: ''ایک دفعہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کے پہاڑ پر تشریف لے گئے ، ہمراہ ابوبکرؓ ، عمرؓ اور عثمانؓ بھی تھے ، اُحد کا پہاڑ لرزنے لگا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قدم مبارک اُحد پر مارتے ہوئے فرمایا: ''اے اُحد! ٹھہر جا ، تجھ پر اس وقت نبی ، صدیق اور شہید کے علاوہ اور کوئی نہیں ۔'' اس کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ: ''**اللّٰھم ارزقني شھادۃ في سبیلک وموتا في بلد حبیبک**''...''اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت کی موت دینا اور موت آئے تو تیرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شہر میں آئے ۔''

آخری ایامِ حیات میں آپؓ نے خواب دیکھا کہ ایک سرخ مرغ نے آپؓ کے شکم مبارک میں تین چونچیں ماریں ، آپؓ نے یہ خواب لوگوں سے بیان کیا اور فرمایا کہ میری موت کا وقت قریب ہے ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک روز اپنے معمول کے مطابق بہت سویرے نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے ، اس وقت ایک درّہ آپ کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور سونے والے کو اپنے درّہ سے جگاتے تھے ، مسجد میں پہنچ کر نمازیوں کی صفیں درست کرنے کا حکم دیتے ، اس کے بعد نماز شروع فرماتے اور نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے ۔ اس روز بھی آپؓ نے ایسا ہی کیا ، نماز ویسے ہی آپؓ نے شروع کی تھی ، صرف تکبیر تحریمہ کہنے پائے تھے کہ ایک مجوسی کافر ابولؤلؤ (فیروز) جو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کا غلام تھا ، ایک زہر آلود خنجر لیے ہوئے مسجد کی محراب میں چھپا ہوا بیٹھا تھا ، اس نے آپؓ کے شکم مبارک میں تین زخم کاری اس خنجر سے لگائے ، آپؓ بے ہوش ہوکر گر گئے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر بجائے آپؓ کی امامت کے مختصر نماز پڑھ کر سلام پھیرا ، ابولؤلؤ نے چاہا کہ کسی طرح مسجد سے باہر نکل کر بھاگ جائے ، مگر نمازیوں کی صفیں مثل دیوار کے حائل تھیں ، اس سے نکل جانا آسان نہ تھا ، اس نے اور صحابیوںؓ کو بھی زخمی کرنا شروع کر دیا ، تیرہ صحابی زخمی ، جن میں سے سات جاں بر نہ ہوسکے ، اتنے میں نماز ختم ہوگئی اور ابولؤلؤ پکڑ لیا گیا ، جب اس نے دیکھا کہ میں گرفتار ہوگیا تو اسی خنجر سے اس نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا ۔ (خلفائے راشدینؓ ، از لکھنویؒ)

بالآخر آپ کی دعائے شہادت کو حق تعالیٰ نے قبول فرمایا اور دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں بلکہ مُصلائے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آپ کو ۲۷ ذوالحجہ بروز چہارشنبہ (بدھ) زخمی کیا گیا اور یکم محرم بروز یک شنبہ (اتوار) آپ رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی ۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر مبارک تریسٹھ برس تھی ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور خاص روضۂ نبویؐ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں آپؓ کی قبر بنائی گئی ۔ **رضي اللہ تعالٰی عنہ وأرضاہ**

# دینِ اسلام کے اساسی وآفاقی تصورات

مولانا عبد المتین
لیاری، کراچی

معاصر مغالطوں میں سے ایک بہت ہی بڑا مغالطہ یہ ہے کہ دینِ اسلام کو چند رسوم کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ دینِ اسلام چند رسمی احکامات کا نام نہیں، بلکہ دراصل یہ تو ایک نظامِ حیات ہے جو کہ انسانی زندگی کے سارے کے سارے گوشوں کا اِحاطہ کیے ہوئے ہے۔

دین کے ساتھ اس طرح کی نسبت کا فروغ بلا وجہ پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس روش کے پس پردہ ایک سیاہ تاریخ ہے، جسے ہم تحریکِ تنویر کے نام سے جانتے ہیں، یہ تحریک اسی مقصد کے لیے قائم کی گئی کہ کس طرح دین کو مذہب تک محدود کردیں، کس طرح اسے ایک وہم وخیال تصور کیا جاسکے، کس طرح خطۂ ارض پر الٰہی اختیارات کی بجائے انسانی اختیارات کا بول بالا کیا جاسکے، کس طرح وحی الٰہی سے چھٹکارا پایا جائے، کس طرح عقل انسانی کو ماخذِ علم سمجھا جائے!۔ الغرض اس تحریک نے ہر وہ طریقہ اپنایا جس کے تحت بندوں کا رشتہ خدا سے کٹ کر رہ گیا اور ''عبداللہ''، ''عبدالدرہم والدینار'' بن گیا۔

مذکورہ تمام مقاصد کا حصول ہی اس تحریک کا منشور تھا، جس میں کامیابی کا نتیجہ آج ہمیں مذہب بیزار اور خدا بیزار انسانوں کی شکل میں دکھائی دیتا ہے، جن کے مطابق اس دنیا کا کوئی ایک معمولی مسئلہ بھی مذہب حل کرنے کے قابل نہیں ہے، بلکہ ان کے مطابق ہم نے ایسے علوم تشکیل دیئے ہیں جو بغیر کسی آسمانی ہدایت کے ہماری ہر اُلجھن کو سلجھن میں بدل سکتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی شخص اپنے نجی معاملہ کی حد تک کوئی مذہبی معاملہ کرتا ہے تو ہم اُسے آزادیِ اظہارِ رائے کا حق دیتے ہوئے نظر انداز کردیتے ہیں، کیوں کہ دراصل ہمارے نزدیک مذہب فقط ایک ذاتی معاملہ ہے، اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب کے ذاتی معاملہ تک محدود ہونے کی صورت میں اس کی انسانی زندگی میں کس قدر اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا ایسے کسی شخص کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے عائلی مسائل کو اپنے مذہب کی روشنی میں حل کرسکے؟ یا یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ خود پر ڈھائے جانے

والے مظالم کا بدلہ اپنی مذہبی تشریحات کے مطابق لے لے؟ یا یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی مالی معاملات میں سود کی گردش سے دور رہ کر ملکی اداروں تک رسائی حاصل کرسکے؟

اگر نہیں تو کس بات کو نجی کہہ کر اہمیت دی جارہی ہے؟ کیا ایک ایسا نجی معاملہ قابل اعتناء رہ سکے گا جو اس کے بنیادی حقوق ہی چھین لے؟ آزادیِ اظہارِ رائے کا نام تو لے لیا گیا، لیکن یہ آزادی فقط اس فلسفۂ حیات کے حامل لوگوں کے لیے ہے جو تحریکِ تنویر سے نکلنے والی شعاعوں کو عقیدہ کی طرح مان لیں اور جان لیں کہ جو کچھ بھی کرنا ہے، اپنی عقل و ہوس کی روشنی میں ہی کرنا ہے۔ یہ سب کیا دھرا دراصل انسان کو ایسے ضابطۂ حیات کی طرف دعوت دیتا ہے جہاں انسان کا رشتہ خالق سے توڑ کر مخلوق سے جوڑا گیا ہے، جس میں خودغرضی اور خودسری کی حدوں کو پار کیا جاتا ہے، جس میں مدِّ نظر فقط مادّہ ہی رہتا ہے، جس میں روحانیت کو نفسیاتی مسئلہ اور وحیِ الٰہی کو مرگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دینِ اسلام جو کہ درحقیقت آسمانی ہدایت اور خداوندِ عالی کے فرامین کا مجموعہ ہے، جسے ہم شریعت کا نام دیتے ہیں، مذکورہ تمام اُمور کے برعکس ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اسلام کا مکمل ضابطۂ حیات ہونا کوئی جدید اصطلاح نہیں ہے، (جیسا کہ آج کل بہت سوں کو یہ گمان ہو رہا ہے) نہ ہی یہ سب تحریکِ تنویر کی طرح ردِّعمل کا سا معاملہ ہے، بلکہ یہ تو خالق کی بسائی ہوئی دنیا میں اسی کے احکامات کے مطابق زندگی کا گزارنا ہے اور یہ نظامِ حیات اتنا ہی قدیم ہے، جتنا کہ یہ عالم جن وانس۔ دراصل اسلام اپنے ماننے والوں سے بغیر کسی قطع و برید کے مکمل شمولیت کا تقاضا کرتا ہے، اور یہ تقاضا کرنا اس امر کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا کوئی بھی ایسا بامعنیٰ پہلو نہیں جس کے متعلق قرآن و حدیث میں اصولی طور پر اور فقہاء کی آراء میں جزوی طور پر اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہو۔ اسی ضابطہ کو اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں اس انداز سے بیان فرماتے ہیں:

''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ أٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِيْ السِّلْمِ كَافَّةً. ''(البقرۃ:۲۰۸)

''اے ایمان والو! دین میں مکمل طور پر داخل ہوجاؤ۔''

آیتِ مبارکہ کے متعلق علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

''يقول تعالى أمرًا عبادَه المؤمنين به المصدِّقين برسوله: أنْ يأخذوا بجميع عُرَى الإسلام وشرائعه، والعمل بجميع أوامره، وترك جميع زواجره ما استطاعوا من ذٰلك. '' (تفسیر ابن کثیر، البقرۃ:۲۰۸)

''اللہ پاک اپنے ان بندوں کو حکم کرتا ہے جو کہ اس کے اس کے رسول کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے تمام اُصول اور قوانین کو لیا کریں، اور اس کے تمام احکامات پر عمل

کریں اور حتیٰ الامکان اسلام کے بتائے ہوئے تمام مناہی سے گریز کریں۔''

اس آیتِ مبارکہ کے علاوہ یہ آیت بھی دین کی کاملیت اور قطعیت پر واضح دلیل ہے:

''اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا.'' (المائدہ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل فرما دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری فرما دی اور تمہارے لیے دینِ اسلام پر راضی ہوا۔''

دین کا یہی رخ سامنے رکھتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''حجة الله البالغة'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''کذٰلک أتی اللّٰہ بشریعة هي أکمل الشرائع متضمنة لمصالح یعجز عن مراعاة مثلها البشر.'' (مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ، ص:۳۲، قدیمی کتب خانہ)

''ٹھیک اسی طرح اللہ پاک کی جانب سے ایک ایسی شریعت عطا ہوئی جو کہ کامل ترین ہے اور ایسی مصلحتوں پر مشتمل ہے کہ جن کی رعایت کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔''

فقہ اسلام کی معروف کتاب ہدایہ کی ترتیبِ وضع پر ایک نظر کی جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ صاحبِ کتاب نے اپنی کتاب تین چوتھائی حصہ کو معاملات سے متعلق موضوعات کے لیے مختص فرما دیا ہے، یہ سعی اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ دینِ اسلام کی جامعیت کس قدر عمیق اور گہری ہے، اسلام ایک دستورِ حیات کی حیثیت سے ہمارے لیے ایسی ترتیب پیش کرتا ہے، جن کی رعایت پیدائش سے لے کر موت تک کی زندگی کے احکامات کو سمجھنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دین کی شعبہ جاتی تقسیم کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسلامی تعلیمات مضامین کے اعتبار سے پانچ حصوں میں منقسم ہیں:

۱: ......عقائد و تصدیقات، ۲: ...... اعمال و عبادات، ۳: ...... معاملات و سیاسیات، ۴: ......آداب و معاشرت، ۵: ......سلوک و احسان۔'' (مقدمہ تعلیم الدین از تھانویؒ، دار الاشاعت)

شریعتِ اسلامی کی پوری عمارت ایمانیات پر منحصر ہے۔ اور ایمانیات کی حیثیت اس ستون کی سی ہے، جس کے بغیر عمارت کی بناء تو دور اس کا تصور بھی محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام میں داخل اور خارج ہونے کا معیار بھی ایمانیات ہی کے شعبہ سے وابستہ ہے۔ ایمانیات کے اساسی شعبہ جات کو ''حدیثِ جبرئیل'' میں بڑی ہی خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

''كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا بَارِزًا لِلنَّاسِ فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا الْإِيْمَانُ؟ قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكِتَابِهٖ وَلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ الْآخِرِ.''

اسی باب کی دوسری حدیث میں ہے:

''وَقَالَ : يَا مُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِيْ عَنْ الْإِسْلَامِ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا .'' (صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان الایمان والاسلام والاحسان)

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن لوگوں میں ظاہر ہوکر بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا: یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر ایمان لے آئے اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اللہ سے ملاقات ہونے پر اور اس کے رسولوں پر اور اس بات پر ایمان لے آئے کہ (مرنے کے بعد) تمہیں دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ اور فرمایا: اس شخص نے کہ (اے محمد!) مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو تو۔''

حدیث مبارکہ میں ایمانیات کے ان شعبوں کا ذکر آ گیا جو کہ اساسیاتِ ایمان ہیں: ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل، ایمان بالآخرۃ۔

ایمانیات کا اوّلین مقصد خالق سے اپنا ناطہ مضبوط کرنا ہے اور اس مضبوطی کا سب سے مؤثر ترین ذریعہ خالق کے آگے اپنی اَنا کا بت توڑ کر تسلیم جاں ہوجانا ہے، جس کو ہم عبادات کے نام سے جانتے ہیں، جو کہ درحقیقت ایمان کے اظہار کا حقیقی اور بلا واسطہ ذریعہ ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار مصروفیات کے ذکر کرنے کے باوجود جو کہ عبادتِ خداوندی ہی کا مظہر تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی حضوریِ رب کا بھی کہا گیا، اس بات کو سمجھانے کی خاطر کہ قربِ خداوندی کا وہ پہلو جس میں بندہ گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے رہتا ہے، ہر حال میں مستحضر رہنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ دنیا کی دوڑ دھوپ کی تھکاوٹ اور بوجھ شوقِ عبادت کی ہلکان و آسودگی میں تبدیل ہوجائے۔ مذکورہ حدیث میں عبادات کی اقسام کا ذکر کیا گیا ہے جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج شامل ہیں۔

اسی طرح اخلاقیات کا شعبہ دین کی حقیقی تربیت اور عام چال وچلن میں اس کی افادیت کے اظہار کا ذریعہ ہے، جس میں اس قدر مختلف النوع آداب واحکام کا ذکر ہے کہ جس پر صفحات کے صفحات لکھے جاچکے ہیں، یہاں تک کہ معلّمِ اخلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد ہی مکارمِ اخلاق کی تکمیل بتلایا ہے:

''إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ.'' (الأحکام الشرعیۃ الکبریٰ، جزء:۳،ص:۳۰۸)

''بے شک مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے، تاکہ میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرسکوں۔''

اخلاقِ حسنہ کو بہترین اشخاص کا وصف قرار دیتے ہوئے فرمایا:

''إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا.'' (صحیح مسلم، باب کثرۃ حیائہ صلی اللہ علیہ وسلم)

''بے شک تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق تم میں سب سے اچھے ہوں۔''

قرآن و حدیث میں جن جن اخلاقی اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: تقویٰ، عفّت، پاک دامنی، حیا، خوش مزاجی، شجاعت، عدل و انصاف، قناعت، استقامت، تواضع، انکساری، سخاوت، صبر وشکر، حلم و بردباری، علم، نرم خوئی، توکل، سچ، اخلاصِ نیت، توبہ، زہد واستغناء، رضاء بر قضاء، عشقِ الٰہی، عشقِ رسول، شوقِ شہادت، اکلِ حلال۔

ان کے بعد دین کا وہ شعبہ ہے جسے ہم معاشرت کے نام سے جانتے ہیں، جس کا تانا بانا اپنے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اور ان سب کے حقوق کی کما حقہ ادائیگی ہی بہتر سے بہتر معاشرے کی تصویر بن سکتی ہے، مخلوقِ خدا کی معاشرتی حیثیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللّٰهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلٰى عِيَالِهٖ.''

(شعب الإیمان للبیہقی، جزء:۶،ص:۴۳)

''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور ساری مخلوق میں سے اللہ کے ہاں بہترین شخص وہ ہے کہ جو اس کے کنبہ کے ساتھ حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہو۔''

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ پاک کے ہاں مطلوبہ اعمال میں سے اہم ترین عمل وہ ہے جو اس کے بندوں سے جڑا ہوا ہے، یعنی حقوق العباد جو کہ معاشرے کی حقیقی روح کے مانند ہیں، اسی وجہ سے حقوق اللہ کی معافی بہ نسبت حقوق العباد کے آسان ہے، کیوں کہ حقوق العباد کا تعلق براہِ راست اللہ کے بندوں سے ہے، اسی عقدہ کو حل کرتے ہوئے فرمایا:

''الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ ارْحَمُوْا أَهْلَ الْأَرْضِ يَرْحَمُكُمْ مَنْ فِيْ السَّمَاءِ.''

(سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الرحمۃ)

''جو رحم کرنے والے ہوتے ہیں رحمٰن ان پر رحم فرماتا رہتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔''

مذکورہ احادیث اس امر کی وضاحت کو کافی ہیں کہ معاشرتی عروج وزوال کا انحصار آپسی معاملات پر ہے۔ جس قدر آپس میں ان صفاتِ عالی کو عام کیا جائے گا، اسی قدر معاشرے کے حسن میں نکھار آتا جائے

گا۔ ورنہ جتنا ان سے روگردانی کی جائے گی، اتنا ہی یہ پھول سکڑ سکڑ کر بے رنگ و بو ہوتا جائے گا۔

وہ اعلیٰ صفات کیا ہیں؟ ان میں سے چند کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے: صفائی ستھرائی، اہلِ محلّہ کے حقوق، سواری کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک، زوجین کے حقوق، والدین کے حقوق، نکاح، مہر، طلاق، رضاعت، ستر پوشی، سلام کا رواج، اکرامِ مسلم، صلہ رحمی، صلح کروانا، مدد کرنا، مریض کی عیادت، وغیرہ۔

ان اساسیات کے بعد معاملات کی حیثیت بھی دین میں ایسی ہی ہے جیسی کہ دیگر اعمال کی۔ آپس کے معاملات کو رسم و رواج اور اپنی اَنا کی بھینٹ چڑھانے کے بجائے ان کو بھی آسمانی ہدایات کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے، جن پر عمل پیرا ہونا اس پرفتن دور میں کہ جس میں دین کا تصورِ عمل نجی معاملات تک محدود ہو چکا ہے زیادہ ضروری ہے اور اشاعتِ دین کی ایک کارگر صورت ہے۔ کتبِ فقہ میں دین کے وہ احکامات جو کہ معاملات کے متعلق ہیں بڑی ہی کثرت اور عرق ریزی کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں، جن پر سرسری نظر ڈالتے ہی یہ بات سمجھ آجاتی ہے کہ دین کے احکامات کس قدر گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے ہیں۔

معاملات کا باب ان اُمور پر مشتمل ہے جن کا تعلق ہماری معاشی، قانونی، اور ذاتی زندگی سے ہے، معاملات کے احکامات اکثر و بیشتر عدمِ التفات کا شکار رہتے ہیں۔ ہم یہاں معاملات کے ان احکامات کو درج کرتے ہیں، جن سے بالواسطہ یا بلا واسطہ سابقہ رہتا ہے، جن میں: زراعت، اجارہ، عاریت، امانت، قرض، وراثت، وصیت، ہدیہ، ہبہ، تحفہ تحائف، رہن، شرکت، مضاربت، تجارت، وکالت، کفالت، صلح، حقِ شفعہ، مالِ وقف شامل ہیں۔

اسلامی ریاست ان تمام شعبہ جات کی بنیاد ہے جو کہ ذکر ہو چکے، اس اعتبار سے کہ یہ ان تمام پر انتظامی بالا دستی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس قدر ریاست منتظم رہتی ہے، اسی قدر دیگر شعبہ جات متحرک رہتے ہیں، اور جیسے ہی ریاست مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے اثرات تمام کو مریض بنا دیتے ہیں، جس کا نتیجہ موت یا زوال ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔

فقہ اسلامی میں ریاستی احکامات کے مخاطب حکمران اور ریاستی ادارے ہوتے ہیں۔ مقاصدِ شریعت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اکثری احکامات ایسے ہیں جن کی تکمیل کے لیے ریاست کا ڈھانچہ انتہائی ضروری ہے، اور ریاست کا نظم وضبط ہی دراصل دین کے دیگر شعبہ جات کی ترویج و ترقی کا ذریعہ بنتا ہے اور ان کی حفاظت اور فعّالیت کو ممکن اور مؤثر بنا دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام کی جامع اور ہمہ گیر صورت ہمیں سب سے پہلے ریاستِ مدینہ ہی کے قیام کے بعد نظر آتی ہے۔ ریاست کا مقصد

بیان کرتے ہوئے اور اس کی اساسی درجہ بندی کرتے ہوئے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

''اَلَّذِیْنَ إِنْ مَّکَّنَّاهُمْ فِيْ الْأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَ أٰتَوُا الزَّکَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ .'' (الحج:۴۱)

''یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم اُنہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور لوگوں کو نیکی کی تاکید کریں، اور برائی سے روکیں، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔''

اسی طرح ریاستی اختیارات کے حقیقی مأخذ اور مصدر کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''إِنِ الْحُکْمُ إِلَّا لِلّٰهِ . ''(یوسف:۴۰)....''حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔'' ساتھ ساتھ ''إِنِّيْ جَاعِلٌ فِيْ الْأَرْضِ خَلِيْفَةً . ''(البقرۃ:۳۰).....''بے شک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں'' کہ انسان تو درحقیقت خلیفہ اور جانشینی کا کردار ادا کرنے کے لیے آیا ہے اور اسی جانشینی کا حق اپنی مختلف النوع ذمہ داریوں کے مطابق احکامِ خداوندی کی بجا آوری کی صورت میں کرتا رہتا ہے، ٹھیک یہی صورت ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد اس انداز سے ادا کرنی پڑتی ہے کہ: ''أَنْ أَقِيْمُوْا الدِّيْنَ . ''(الشوریٰ:۱۳)....''کہ تم دین کو قائم کرو'' کے تحت اللہ کی سرزمین پر اللہ کا نظام نافذ کرنا پڑتا ہے۔

قرآن وحدیث اور فقہائے کرام کی تفصیلات سے اسلامی ریاست کے لیے جو جو شعبہ جات ناگزیر ہیں، وہ درج ذیل ہیں: جہاد، خارجہ امور، امن وامان، امورِ داخلہ، پولیس، بیت المال، نظامِ قضاء، عدالتیں، اقامتِ حدود وتعزیرات، نظامِ زکوٰۃ، اقامتِ صلوٰۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، شورائی نظام، اطاعتِ امیر، وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام کے متعلق مستقل احکامات اور تجاویز موجود ہیں، جن کا احاطہ یہاں طوالت کو لازم ہے، ان سب اعمال پر عمل کرنے کی حقیقی صورت اسلامی ریاست ہی کی صورت میں ممد ومعاون ثابت ہوگی، ورنہ ریاست کے اسلامی نہ ہونے کی صورت میں مفید تو بہرحال رہے گی، لیکن خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوسکیں گے کہ جن سے مقاصدِ شریعت کا بالکلیہ حصول ممکن ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر کی اطاعت کو قرآن کریم میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے ساتھ ذکر فرمایا:

''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَأُولِيْ الْأَمْرِ مِنْكُمْ.''(النساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو اور تم میں سے جو لوگ صاحبِ اختیار ہوں ان کی بھی۔''

# معاشرے کی اصلاح و بگاڑ پر مالی رویوں کے اثرات

(دوسری قسط)

مولانا محمد طفیل کوہاٹی
مدیر ندوۃ التحقیق الاسلامی، کوہاٹ

## اسراف وتبذیر

معاشرے کے بگاڑ میں اسراف وتبذیر کا کردار بھی کچھ کم نہیں، جب ''شُحّ'' کے رویّے نے انسان کو زیادہ سے زیادہ مالی وسائل کی بڑھوتری کے لیے ہمہ قسم بندشوں سے آزاد کر دیا تو اس رویّے کے حاملین نے انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنی مصنوعات کو دنیا میں اس انداز سے پھیلایا کہ ان کی موجودگی میں کسی اور کو پنپنے کا موقع نہ مل سکے اور لوگ انہی سے مال خریدنے پر مجبور ہوں۔ دوسری طرف انہوں نے انسان کی فطری کمزوری یعنی خواہشِ نفس کو اُبھارنے کی اشتہار بازی کے ذریعے پوری منصوبہ بندی کی اور اس کی فکر وسوچ کو اس سطح پر لایا کہ وہ روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لیے ضرورت کی بجائے سہولت وآسائش، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نمائش اور تعیُّش کو ترجیح دے، جیسا کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کا طرزِ عمل سب کے سامنے ہے۔ اس سے ہماری ثقافت اور کلچر میں بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں۔ پہلے لوگ موچی سے جوتے بنواتے تھے جو سال ہا سال استعمال ہوتے تھے، اب ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مہنگے، نمائشی، بنے بنائے جوتوں کا رواج ہو چلا ہے، جن کی مضبوطی ہاتھ سے بنائے ہوئے جوتوں سے کم ہے، مزید یہ کہ ہر مہینے نیا ڈیزائن آ رہا ہے اور انسانی فطرت اور خواہشِ نفس قناعت کو پرے پھینک کر ''کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ'' (ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے) کے تحت اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ ہماری ثقافت سے درزی ختم ہوتا جا رہا ہے اور ان کمپنیوں کے ریڈی میڈ لباس نے انسان کو خواہش کا پجاری اور تن آسان بنا دیا ہے۔ کبھی گوالا بھی ہماری ثقافت کا حصہ تھا، اب شہروں میں تو وہ ڈھونڈے سے نہیں ملتا، ملٹی نیشنل کمپنیوں کا بدذائقہ اور مضرِ صحت دودھ بڑے شوق سے خریدا اور استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان دودھوں میں سے اکثر سرے سے دودھ ہی نہیں، بلکہ مختلف کیمیکل چیزوں کا مجموعہ

ہیں۔ ہماری ذہنی پستی کا اندازہ لگائیں کہ قدرتی دودھ کو جراثیم زدہ اور کیمیکل سے آلودہ ڈبوں کو آبِ حیات باور کرایا جارہا ہے۔

اب وہ دور گیا کہ گھر کی خواتین بیٹھ کر اونی دھاگوں سے سویٹر بن لیں، یا مرچیں کوٹ کر دیسی مصالحہ بنالیں، اب تو ملٹی نیشنل کمپنیوں کا راج ہے اور یہ ساری چیزیں انتہائی ناقص، ہم سے دس گنا زیادہ قیمت وصول کر کے صرف چمکیلی پیکنگ میں ہمیں دے دی جاتی ہیں۔ یہ رویہ ''شُحّ'' کے حاملین کا وہ گھناؤنا وار ہے کہ مال ہتھیانے کے واسطے اسراف وتبذیر اور عدمِ قناعت کے کلچر کو فروغ دیا جائے۔ آج معاشرے کو غربت کے جس عفریت نے گھیر رکھا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام آدمی کو اشیائے ضرورت اصل قیمت پر مہیا نہیں اور وہ نمائش کے جملہ اخراجات برداشت کر کے ہی اسے حاصل کرسکتا ہے، حتیٰ کہ صابن کی ٹکیہ خریدنے والے پر بھی اس کی عمدہ اور مہنگی پیکنگ، لاکھوں کے اشتہارات اور اس کی نمائش کرنے والی ماڈل گرلز کی فیسوں کا بوجھ آپڑتا ہے اور اس جرعۂ زہرآب (زہر کے گھونٹ) کے بغیر وہ ضرورت کی تکمیل نہیں کر پاتا۔ یہی حال تقریباً ساری ملکی وغیر ملکی مصنوعات کا ہے۔

اسلام نے تکمیلِ ضرورت میں ''نمائش'' کے درجہ کو اسراف کہا ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کی ہے، کیونکہ اس کی کوکھ سے وسیع پیمانے پر غربت جنم لیتی ہے۔ اسراف کا ایک بڑا درجہ یہ بھی ہے کہ ضرورت سے زیادہ چیزیں بلامصرف ضائع کردی جائیں۔ آج گھروں اور ہوٹلوں میں روٹی سالن کے ضیاع سے لے کر عالمی سطح تک قیمتی چیزوں کی پامالی فیشن کی شکل اختیار کرچکی ہے اور اس روگ سے کوئی خال خال ہی بچا ہوا نظر آتا ہے۔

اسراف سے بڑھ کر خطرناک رویہ ''تبذیر'' ہے۔ ''تبذیر'' بذر سے ماخوذ ہے، اس کا معنیٰ تخم ریزی کا آتا ہے، کسان جس طرح تخم ریزی کرتے وقت اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ دانہ کھیت میں کہاں گر رہا ہے، اسی طرح ''مُبَذِّر'' بھی مال کے خرچ کرنے میں اس شعور سے عاری ہوتا ہے کہ میرے مال کا مصرف حلال ہے یا حرام۔ قرآن مجید نے اس رویے کا نقشہ کھینچتے ہوئے ''مُبَذِّرِیْن'' کو ''إخوان الشیاطین'' کا لقب دیا ہے، چونکہ شیطانی قویٰ شر و برائی کا سرچشمہ ہوتی ہیں، اس لیے ''تبذیری رویہ'' بھی انسان کو اپنے مالی وسائل ناجائز خواہشات کی تکمیل اور غیر قانونی اعمال و افعال پر صرف کرواتا ہے۔ معاشرے میں بخل وشح اور اسراف وتبذیر کے اجتماعی اِرتقا سے تقسیمِ دولت کی ناہمواری، غربت، چوری، ڈاکہ زنی، جوابازی، کرپشن، رشوت خوری، خودکشی، قتل وغارت گری اور بدامنی جیسے مہلک عناصر کو بڑی تیزی سے تقویت ملی ہے اور نجی سطح سے لے کر عالمی سطح تک کے معاشرتی فسادات میں ان رویوں کا بنیادی کردار ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان رویُّوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فسادات کا حل یہی ہے

کہ تیسرے رویہ ’’اقتصاد و انفاق فی سبیل اللہ‘‘ کو رواج دیا جائے اور اس سے معاشرتی فلاح و بہبود میں کام لیا جائے۔

## اقتصاد اور معاشرے پر اس کے اثرات

اقتصاد سے ہماری مراد اسلام کا معاشی عدل و اعتدال ہے، جس کی طرف حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی سے رہنمائی ملتی ہے: ’’اَلْإِقْتِصَادُ فِيْ النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ .‘‘(مشکوٰۃ)..... ’’خرچ میں میانہ روی آدھی معیشت ہے۔‘‘

اقتصاد کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کا دائرہ اتنا ہی رکھے جتنے اس کے مالی وسائل ہیں اور مالی وسائل کی بہتات کی صورت میں وہ ضرورت پوری کرنے میں سہولت اور آسائش کے درجے سے آگے نہ بڑھے۔ کسب میں افراط سے بچے اور تمام خدائی و اخلاقی پابندیوں کا پاس رکھے، کسی حلال روزگار سے نہ کترائے۔ آج ہماری ایک بڑی نسل معاشرے پر اس لیے معاشی بوجھ ہے کہ انہوں نے زندگی گزارنے کا ایک معیار طے کرلیا ہے۔ اگر اس معیار کی نوکری اور معاشی وسائل انہیں دستیاب نہ ہوں تو وہ عضوِ معطل ہی بنے رہتے ہیں، حالانکہ وہ معمولی تجارت، کھیتی باڑی اور عام ذرائع روزگار اختیار کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکتے ہیں۔ دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں نوجوان جانور پالتے، تجارت اور کھیتی باڑی کرتے، جنگل سے لکڑیاں لاکر بیچتے اور خواتین چرخہ کاتتیں۔ یہی طرز بعد کی خلافتوں میں رہا۔ اسراف و تبذیر کی روش اسلامی معاشرے میں عیب اور چھچھورپن کی علامت تھی اور اسے خود سر اُمراء اور بادشاہوں کا وطیرہ سمجھا جاتا۔ اگر آج بھی مسلم معاشرہ ’’اقتصاد‘‘ کے گراں قدر وصف سے کام لیتا ہے تو معاشرے میں عوامی سطح پر اسراف و تبذیر اور ان کے مہلکات پر کسی قدر قابو پایا جاسکتا ہے اور غربت و معاشی ناہمواری کا بھی تدارک ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں معاشرے کا مال دار طبقہ انفاق فی سبیل اللہ سے کام لے کر غرباء و مساکین کو اس سطح پر لائے کہ وہ معاشرے پر ’’معاشی بوجھ‘‘ کے دائرے سے نکلیں۔ لیکن یہ بات پیشِ نظر رہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے بل بوتے پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات کا جو جال بچھا ہے اس نے دیسی ساختہ اشیاء اور عام پیشوں کو نابود کر دیا ہے، اس لیے عوامی سطح پر خود اعتمادی اور خود انحصاری کے شعور کو جلا بخشنے کی ضرورت ہے اور ان کے بائیکاٹ اور اپنی مصنوعات کو فروغ دینا ہے، تاکہ ’’اقتصاد‘‘ کے ثمرات کا حصول پوری طرح ممکن ہوسکے۔

## انفاق فی سبیل اللہ اور اصلاحِ معاشرہ پر اس کے اثرات

انفاق فی سبیل اللہ کے دو پہلو ہیں: ایک وجوبی اور دوسرا استحبابی۔ وجوبی پہلو کے دائرے میں

زکوٰۃ، عشر، خراج، صدقۂ فطر، قربانی، میراث، کفالت کی بعض شقیں اور کفارات وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ استحبابی پہلو کا تعلق ایمان کی استعدادی حالت سے ہے۔ ایمان ویقین اور اللہ تعالیٰ سے محبت وتعلق میں جوں جوں اِرتقا ہوتا ہے، اسی حساب سے زائد از ضرورت مال ودولت کو معاشرہ کی اجتماعی بھلائی کے کاموں میں استعمال کرنے کا شعور بڑھتا جاتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے معاشرتی اصلاح کا طریق یہ ہے کہ مال کسی مصیبت کو دور کرنے، زیردستوں کی نگہداشت اور کسی عمومی مصلحت کی تکمیل میں صرف کیا جائے۔ اسلام نے اس مقصد کے حصول کے لیے جو نظام ہمیں دیا ہے، اس کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

## معاشرتی اصلاح میں زکوٰۃ کا کردار

زکوٰۃ اسلام کے ارکانِ پنج گانہ میں سے ایک بنیادی رکن اور معاشرے کی مالی اصلاح کے لیے ایک وسیع ترمدّ ہے۔ قرآن کریم نے کئی مقامات پر اس فریضے کو ''نماز'' کے ساتھ ذکر کیا ہے، اسلام نے زکوٰۃ کا دائرہ چار اصنافِ مال میں بند کیا ہے۔ یعنی مویشی، فصلیں اور پھل، سونا، چاندی اور سامانِ تجارت، گوکہ اب معاملات کاغذی کرنسی سے سرانجام پاتے ہیں، اس لیے زکوٰۃ نکالتے وقت ان کی قیمت کی تحدید چاندی کی قیمت ونصاب سے کی جائے گی۔

مویشی، سونا، چاندی اور سامانِ تجارت جب بقدرِ نصاب ہوں تو سال گزرنے پر مخصوص حصہ دوسرے ضرورت مند افراد پر خرچ کرنا لازمی ہوگا، جب کہ فصل وپھل کی زکوٰۃ بوقتِ کٹائی واجب ہوگی۔ معاشرے کی مالی اصلاح میں زکوٰۃ کے کردار کا اندازہ درج ذیل نکات سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱:- اسلام میں مال داری کی حد بظاہر کم مقدار پر مبنی ہے جس کی وجہ سے زکوٰۃ دہندگان کے دائرے میں اکثر افراد داخل ہوجاتے ہیں۔ اس سے معاشرہ کے مالی بگاڑ کی اصلاح پر اسلام کی گہری توجہ اور ترکیز کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے عام واجب کی رعایت کے احساس میں عوامی قاعدہ کی تنظیم ہوتی ہے اور شعور واحساسِ پختگی کے ایسے مرحلے پر پہنچ جاتا ہے، جہاں معاشرہ انفرادی سم رسیدگی سے محفوظ ہوکر اجتماعی نظام میں زندگی گزارنے کے قابل ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اجتماعی حقوق ایک عام انسانی رشتہ سے وابستہ کردیئے جاتے ہیں، اس کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ.'' (المعارج:۲۴،۲۵)

ترجمہ: ''اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے مانگنے والے اور محروم کا۔''

۲:- اسلامی معاشرہ کے اجتماعی تکافل کی ذمہ داری میں زکوٰۃ کے مستحکم کردار کا اندازہ اسی سے لگائیں کہ یہ اسلام کے بنیادی پانچ ارکان میں شامل ہے اور اسلام نے اسے نفس اور مال کی پاکیزگی کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس شعور واحساس کے تحت جب زکوٰۃ دہندہ زکوٰۃ دیتا ہے تو اس کے ذہن

میں خدا کی بندگی کا تصور راسخ ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں فطری جوش و دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے، جس سے اس کی روحانیت پر خوشگوار اثرات پڑتے ہیں، گویا یہ اسلام کے نصب العین (یعنی معرفتِ الٰہی وتعلّق بندگی کی استواری) کا بنیادی مظہر ہے، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

’’خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ.‘‘ (التوبہ:۱۰۳)

ترجمہ: ’’ان کے مال میں زکوٰۃ لواور اس کے ذریعے ان کو پاک اور بابرکت کرو اور دعا دو اُن کو۔‘‘

۳:- اجتماعی تکافل اور معاشرے کے بگاڑ کی اصلاح میں اس بنیادی کردار کے پیشِ نظر اس فریضے کی ادائیگی میں سختی برتی گئی ہے۔ اگر کوئی فرد یا جماعت زکوٰۃ ادا نہ کرے تو حکومتِ وقت اس جرم پر اُسے سزا دے گی اور اس سے بزورِ زکوٰۃ لی جائے گی۔

۴:- اس کے کردار کا اندازہ اس حکم سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ زکوٰۃ فرض و واجب ہونے کے بعد ساقط نہیں ہوتی اور اگر کسی سال اس کی ادائیگی میں کوتاہی برتی گئی تو آئندہ اس کا ادا کرنا ضروری ہوگا۔

۵:- مزید براں اس فریضے میں کوتاہی پر اُخروی سزا اور وعید بھی آئی ہے، تاکہ اس کے فوائد وثمرات کے حصول میں معاشرے کے اندر کسی بھی پہلو سے کوتاہی نہ برتی جائے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

’’وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ.‘‘ (التوبہ:۳۴-۳۵)

’’جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے، جس دن اس دولت کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ سو چکھو، جسے تم جمع کرتے تھے۔‘‘

۶:- قرآن کریم نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف مقرر کر کے معاشرتی اصلاح کے لیے اس کا دائرہ خوب پھیلا دیا اور ان میں وجہِ استحقاق کی قدرِ مشترک ’’ناداری‘‘ اور افلاس کو بیان کیا، تاکہ معاشرے میں کہتری کے شکار طبقات تک مال کی رسائی کا قانونی بندوبست ہو۔ اسلام نے مصارفِ زکوٰۃ میں اس پہلو کی خصوصی رعایت کی ہے کہ معاشرے میں افراد کی حفاظت ونگہبانی ہو، تاکہ وہ اقتصادی اور انسانی ہر دو پہلو سے اپنی خدمات میں اضافہ کرتے رہیں۔

۷:- قرآن کریم نے ان مصارف میں سے فقراء ومساکین کو بیان فرمایا ہے۔ علامہ ماوردیؒ لکھتے ہیں کہ فقراء ومساکین کو اس قدر دینا ضروری ہے کہ ان کی فقر ومسکنت ختم ہو جائے اور غناء کے کم

از کم درجہ (یعنی غنائے شرعی سے قدرے کم درجہ) تک پہنچ جائیں، تاکہ وہ عملی جدو جہد میں شریک ہو سکیں۔ (تفسیر ماوردی، ج:۲،ص:۳۷۴)

اس میں اس امر کی نشاندہی ہے کہ یہ مقصود نہیں کہ غریب کو صرف کھانے پینے کی ضرورتیں فراہم کر دی جائیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ تجارت، صنعت اور زراعت کے ذریعے معاشرے کی ایک پیداوری اور نفع بخش قوت بنے اور اپنے دائرۂ عمل میں اکتساب پر قادر ہو جائے۔ اسی کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول میں بھی راہنمائی ملتی ہے کہ میں اعراب کو بار بار صدقہ دیتا رہوں گا، خواہ ان میں ہر ایک کے پاس سو اونٹ ہو جائیں۔ (کتاب الاموال لابی عبید، ص:۵۶۵)

۸:- ان مصارف میں ''الرقاب'' یعنی غلاموں اور قیدیوں اور ''غارمین'' یعنی قرض داروں کی خلاصی کو بطور مصرف ذکر کرنے سے بھی اس پہلو پر کافی روشنی پڑتی ہے، کیونکہ غلام کے مقومات ضائع ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کچھ نہیں کر سکتا، اسی طرح قیدی بھی دشمن کے ہاتھوں مجبورِ محض بن جاتا ہے، لہٰذا ان کی آزادی کے لیے زکوٰۃ کی رقم لگانے کا حکم دے دیا، تاکہ ان کی صلاحیتوں سے معاشرہ آزادانہ طور پر مستفید ہو۔ اگر اس صورت کو معطل رکھا جاتا تو معاشرے کے اقتصادیات میں فساد کا دائرہ یقیناً بڑھ جاتا۔ زکوٰۃ اس فساد کو ختم کرنے میں بنیادی کردار پیش کرتی ہے۔

۹:- زکوٰۃ کا ایک مصرف ''غارم'' ہے۔ غارم کی تعریف میں وہ شخص داخل ہے جس نے کوئی مالی بوجھ برداشت کر لیا ہو۔ یہ اس کی مروت وحق پروری کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ شریعت نے اس کو زکوٰۃ کا مصرف بنا کر اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ کہیں کرم نوازی وحق پروری کی عقلی ومعنوی صلاحیت مرجھا نہ جائے۔ دوسری طرف یہ پہلو بھی پیشِ نظر ہے کہ وہ اس بوجھ سے خلاصی پا کر معاشرے میں از سرِ نو صحت مند کردار کا حامل ہو جائے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ: اگر غارم نے کسی نیکی اور اصلاح کے کام کے لیے مالی بوجھ برداشت کر لیا ہو تو اسے زکوٰۃ سے اس کا خرچ کیا ہوا مال دیا جائے گا، اگرچہ وہ غنی ہو۔ (تفسیر قرطبی، ج:۸،ص:۱۸۴)

کیونکہ اس طرح کے لوگ دراصل سماجی زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زکوٰۃ معاشرے میں مضبوط اقتصادی اور سماجی کرداروں کو زندہ رکھنے، ان کی حوصلہ افزائی اور نشو ونما میں کس قدر مؤثر اور نمایاں کردار ادا کر سکتی ہے۔

۱۰:- زکوٰۃ کا ایک مصرف ''مؤلفة القلوب'' ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھانے کی توقع ہو، یا جن سے وقار اور دبدبہ میں اضافہ ہو، یا جو اُمت کے مصالح کو بروئے کار لائیں اور اس کی مدافعت کریں اور اس کے دشمن پر نظر رکھیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا

غیر مسلم۔ یہ مصرف اُمت کے سیاسی واقتصادی مصالح میں زکوٰۃ کے کردار پر دلالت کرتا ہے اور یہ بات واضح کرتا ہے کہ اسلام نے کس طرح انسانی معاشرے کی ضروریات کا اِحاطہ کرکے ان کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے، گوکہ جمہور فقہاء کے ہاں اسلام کو سیاسی غلبہ ملنے کے بعد سے یہ مصرف قابلِ عمل نہیں رہا۔

زکوٰۃ کے دیگر مصارف میں بھی یہی پہلو پیشِ نظر ہے کہ معاشرے کے کمزور یا سماج کے لیے مفید بعض طبقات کا معاشی بوجھ برداشت کیا جائے، اس مختصر سے جائزے سے معاشرے کی اصلاح میں زکوٰۃ کے کردار پر اِجمالی روشنی پڑتی ہے۔ نظامِ زکوٰۃ کے رواج ونفاذ سے معاشرے میں ضروریات کی فراوانی اور سہولت کی ارزانی یقینی ہے۔ اس نظام کے قیام کا مقصد لوگوں کے درمیان زندگی کو بلند کرنا، عام افراد کو آسائش وسہولت بہم پہنچانا اور ان کے درمیان اعتماد ومحبت کا رشتہ استوار کرنا بھی ہے اور یہ تبھی ممکن ہے کہ مال ودولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہے، بلکہ معاشرے کے زیادہ سے زیادہ افراد کے ہاتھوں تک پہنچے اور ممکن حد تک ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ سرمایہ موجود ہو، تاکہ افزائش اور بار آوری کا عمل تیز اور وسیع ہوسکے۔

## صدقۂ فطر وقربانی اور معاشرتی اصلاح میں ان کا کردار

انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے معاشرتی اصلاح کا دوسرا طریقہ صدقۂ فطر اور قربانی ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو خوشی منانے کے لیے دو تہوار دیئے ہیں: ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحی۔ پھر ان دونوں تہواروں میں اللہ تعالیٰ نے مالدار مسلمانوں پر مالی وظائف رکھ دیئے۔ عید الفطر کی نماز سے پہلے ہر مال دار مسلمان پر اپنا اور اپنے زیرِ کفالت بعض افراد کا صدقۂ فطر دینا واجب قرار دیا ہے، اس کے لیے نصاب کا نامی ہونا اور سال گزرنا بھی شرط نہیں، لہٰذا اس کا دائرہ زکوٰۃ سے بھی زیادہ وسیع ہوجاتا ہے اور اس کے ذریعے اجتماعی مسرت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جاسکتی ہے۔ صدقۂ فطر معاشرے کے ان غریب طبقات پر خرچ کیا جائے گا جن کے پاس ایسے مواقع پر خوشی کے اسباب اختیار کرنے کی وسعت وگنجائش یا تو ہوتی نہیں یا بہت محدود ہوتی ہے، تاکہ یہ طبقات احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں اور ان مقدس ایام میں اپنے اور اپنے بچوں کے کھانے پینے اور لباس کا مناسب بندوبست کرسکیں۔ اسی طرح عید الاضحیٰ میں صاحبِ استطاعت مسلمانوں پر جانور کی قربانی واجب قرار دی گئی ہے، چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہمانی کے ایام ہیں، تاکہ اس کے بندے گوشت کی پُرلطف غذا سے محظوظ ہوں، اس لیے صاحبِ ثروت لوگوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ معاشرے کے غریب ولاچار لوگوں کو اس خوشی میں اپنے ساتھ شریک کریں، تاکہ وہ اس قدر احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں کہ انہیں زندگی کی جائز خوشیاں بھی نہ مل سکیں۔

(جاری ہے)

# مرابحہ مؤجّلہ

مولوی فضل الرحمٰن
متعلم تخصص فقہِ اسلامی، جامعہ

## اِرتقائی، واقعاتی اور تجزیاتی مطالعہ (پانچویں اور آخری قسط)

## بیعِ مؤجل/مرابحہ مؤجلہ کا آئینۂ ادوار اور اس کا تقابلی جائزہ

اب ہم اس بات کا مطالعاتی تناظر میں جائزہ لیں گے کہ بیع مؤجل کے لیے جو طریق کار وضع کیا گیا تھا، بعد میں چل کر کیا اس میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی یا نہیں؟ اور کیا اس طریقِ کار کو بینکوں نے پوری طرح قبول کیا یا وہ ''کچھ'' نہ ماننے پر مصرّ رہے؟!

۱۹۸۱ء میں سب سے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل نے بیعِ مؤجل کا جو طریقِ کار عبوری دور کے لیے تجویز کیا، وہ پیشِ خدمت ہے:

''بیع مؤجل کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ خرید وفروخت کا ایسا معاملہ ہے جس میں شئے متعلقہ کی قیمت فوری طور پر ادا کرنے کے بجائے کچھ عرصے بعد یک مشت یا قسطوں کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ صنعتی اور زرعی شعبوں کے علاوہ اندرونی اور بیرونی تجارت میں سرمائے کی فوری ضروریات کی تکمیل کے لیے بڑا مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بوری کھاد کی قیمت بینک کے لیے پچاس روپے ہے، لیکن بینک یہ کھاد سرمائے کے ضرورت مند کسانوں کو اپنے ایجنٹ کی معرفت ۵۵ روپے فی بوری کے حساب سے فروخت کرے گا اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کی قیمت ایک مقررہ مدت کے بعد ادا کریں گے۔ جب کہ بینک اپنے ایجنٹ کو پچاس روپے فی بوری کے حساب سے قیمت اس وقت یا اس سے پہلے ادا کر دے گا، جبکہ ایجنٹ بینک کے حسبِ ہدایت مال کسانوں کو مہیا کر دے گا۔.....اگرچہ یہ طریقہ اسلامی شریعت کے مطابق ہے، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ خرید کردہ شے متعلقہ ادارے کے حوالے کیے جانے سے پہلے بینک کے قبضے میں آجائے، تاہم اس شرط کی تکمیل کے

لیے اتنی بات کافی ہے کہ بینک نے جس ادارے سے مال خریدا ہے وہ اس مال کو بینک کے نام پر علیحدہ کر دے اور پھر اس شخص کو دے دے جسے بینک نے اس سلسلے میں مجاز ومختار قرار دیا ہوا اور اس میں وہ شخص بھی شامل ہے جس کے لیے مال خریدا گیا ہے۔‘‘(۱)

۱۹۸۵ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی کتاب ’’بلاسود بینکاری (عبوری خاکہ)‘‘ منظر عام پر آئی۔ اس میں ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب مرابحۂ مؤجلہ کا طریق کار ذکر کیا ہے۔(۲) اس میں سوائے اِن تین چار باتوں کے جو اسلامی نظریاتی کونسل کے پیش کردہ طریق کار میں نظر نہیں آئیں، باقی سب طریق کار یکساں ہے:

۱:- ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی کتاب میں ’’بیع مؤجل‘‘ کے ساتھ ساتھ ’’بیعِ مرابحہ‘‘ کا ایک نیا نام نظر آتا ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں نہیں ہے۔

۲:- ڈاکٹر قادری صاحب کی کتاب میں ’’قانونی قبضہ‘‘ کا تذکرہ ملتا ہے جس کا ذکر کونسل کی رپورٹ میں نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

’’(i) ضروری نہیں کہ خریدے ہوئے مال کا ظاہری قبضہ بھی بیچنے سے پہلے بینک کے پاس ہو۔ وہ مال کی خریداری کے ساتھ جب اپنی ملکیت کے کاغذات مکمل کر لیتا ہے تو اس کا قانونی قبضہ ثابت ہو جاتا ہے اور اسی سے اس مال پر اس کا حقِ تصرف قائم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا شرعاً جوازِ بیع کے لیے یہی قبضہ کافی ہے، کیونکہ ظاہری قبضے کا مقصد بھی حقِ تصرف کو ممکن بنانا ہوتا ہے، جو آج کے دور میں اموال کی بیع وشراء میں قانونی قبضے سے بتام وکمال پورا ہو رہا ہے۔‘‘(۳)

۳:- ڈاکٹر قادری صاحب کی کتاب میں اس بات کا ذکر بھی موجود ہے کہ سودی بینکوں کے شرحِ سود سے ہٹ کر الگ شرح مقرر کی جائے، تاکہ شرحِ سود سے مماثل نہ معلوم ہو۔ ملاحظہ ہو:

’’(ii) اُدھار کی صورت میں اضافی قیمت وصول کرنا بھی شرعاً جائز ہے، لیکن از راہِ احتیاط قیمت کا اضافہ اس شرح سے کیا جائے کہ شرح سود سے مماثل نہ معلوم ہو، ورنہ غلط فہمی پیدا ہوگی۔‘‘(۴)

اس بات کا ذکر کونسل کی رپورٹ میں نظر نہیں آیا۔

۴:- ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی کتاب میں اس احتیاطی پہلو کا ذکر بھی ملتا ہے جو کونسل کی رپورٹ میں نہیں ہے:

’’(iv) فریقین باہمی رضامندی سے جس قیمت پر چاہیں بیع کریں۔ اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ (لیکن معاشرے میں مہنگائی اور ناجائز منافع خوری کے رجحان کو روکنے کے لیے قانوناً یا رواجاً منافع کی کوئی خاص شرح اور اضافی قیمتوں کے لیے کوئی معقول حد مقرر کی جاسکتی ہے۔ ایسے

احکام مصالحِ عامہ، ضرورت اور استحسان کے شرعی اصولوں کے تحت آتے ہیں )۔ (۵)

۱۴۲۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء میں ''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ'' کا بلاسود بینکاری کے حوالے سے جو اجلاس ہوا، اس میں مرابحہ مؤجلہ کا جو طریقِ کار طے کیا گیا، اس میں سابقہ کونسل کی رپورٹ اور جناب ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی کتاب میں ذکر کردہ طریقِ کار سے درج ذیل باتیں صریح اضافی معلوم ہوتی ہیں:

۱:- عمیل کے بحیثیت وکیل خریدنے سے لے کر بینک سے اپنے لیے خریدنے تک کا جو درمیانی وقفہ ہوگا اس میں ٹریکٹر بینک کی ملکیت اور بواسطہ وکیل اس کے تقدیری قبضے میں رہے گا اور بینک کے ضمان میں ہوگا۔ پھر جب عمیل اور بینک کے درمیان بیع منعقد ہوجائے گی اس وقت ٹریکٹر کا ضمان عمیل کی طرف منتقل ہوگا۔

۲:- وکالت کا عقد کرتے وقت عمیل بطور وعدہ اس بات کی یقین دہانی کرائے گا کہ جب ٹریکٹر بینک کی ملکیت اور ضمان میں آجائے گا تو وہ یہ ٹریکٹر بینک سے پہلے سے طے شدہ قیمت پر خرید لے گا۔

۳:- چوں کہ ٹریکٹر عمیل نے بحیثیت وکیل خود خریدا ہے اور اس کے جملہ مطلوبہ اوصاف سے وہ خود واقف ہے، اس لیے جب بینک اس کو ٹریکٹر فروخت کرے گا تو اسے ''جیسے ہے جہاں ہے'' کی بنیاد پر فروخت کرے گا، جسے فقہی اصطلاح میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ بیع ''بشرط البراء ۃ من کل عیب'' ہوگی، لہٰذا عمیل بیع کی تکمیل کے بعد کسی عیب کی بنیاد پر بینک کو وہ ٹریکٹر نہیں لوٹا سکے گا۔

۴:- ''مرابحہ مؤجلہ'' کے معاہدے کے تحت قیمت کی ادائیگی کی جو تاریخ متعین کی گئی ہے اس پر ادائیگی کی ضمانت حاصل کرنے کے لیے بینک عمیل سے کوئی وثیقہ طلب کرسکے گا......۔

۵:- عمیل سے عقدِ مرابحہ کرتے وقت یہ لکھوالیا جائے گا کہ اگر وہ ادائیگی کی اہلیت کے باوجود بروقت ادائیگی نہ کرسکا تو وہ اپنے واجب الادا دَین کا ایک مخصوص فیصد حصہ ایک خیراتی فنڈ میں چندے کے طور پر ادا کرے گا۔'' (۶)

بطورِ تنبیہ یہاں ایک بات کی تصریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ'' کے اجلاس کی جو روداد مرتب کی گئی، اس میں دو باتیں لکھنے سے رہ گئیں۔ بعد میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا تدارک کیا اور ان باتوں کو روداد کے حاشیہ پر رقم کردیا۔

ذیل میں ان دو باتوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱:- ''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ'' کے اجلاس میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ بینک عمیل

(خریدار) کے قبضے کی تصدیق کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیجے گا۔ یہی بات اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں بھی لکھی گئی ہے کہ ''بینک نے جس ادارے سے مال خریدا ہے وہ اس مال کو بینک کے نام پر علیحدہ کردے اور پھر اس شخص کو دے دے جسے بینک نے اس سلسلے میں مجاز ومختار قرار دیا ہو۔''(۷)

یعنی بینک کی جانب سے نمائندہ یا مجاز یا مختار ہونا چاہیے۔ لیکن ''مجلسِ تحقیق مسائلِ حاضرہ'' کے اجلاس کی روداد مرتب کرتے وقت یہ بات لکھنے سے رہ گئی، چنانچہ مجلسِ تحقیق کی روداد پڑھیے:

''بینک کے لیے از خود تمام مطلوبہ اشیاء کی خریداری براہِ راست مشکل ہے، اس لیے وہ مطلوبہ اشیاء کی خریداری کے لیے خود عمیل کو اپنا وکیل بنادے گا اور یہ عمیل پہلے وہ چیز مثلاً ٹریکٹر بینک کے وکیل کی حیثیت سے خرید کر قبضہ میں لے لے گا اور خریداری کی تکمیل پر بینک کو مطلع کردے گا کہ میں نے وکالت کی بنیاد پر آپ کے لیے ٹریکٹر خرید کر اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اب میں وہ ٹریکٹر آپ سے اپنے لیے خریدنا چاہتا ہوں۔''(۸)

دیکھئے! اس مذکورہ بالا عبارت میں ''بینک کے نمائندہ'' کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لیے بعد میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے روداد کے اس حصے پر درج ذیل الفاظ کے ساتھ حاشیہ رقم فرمایا:

''مجلس نے یہاں یہ اضافہ بھی کیا تھا جو غالباً سہواً تحریر سے رہ گیا ہے: ''بینک عمیل کے قبضے کی تصدیق کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیجے گا، قبضہ ثابت ہونے پر اس کا سرٹیفکیٹ دے گا۔۱۲ ارشید۔''(۹)

لیکن ۱۹۹۸ء میں منظرِ عام پر آنے والی کتاب ''اسلامی بینکاری کی بنیادیں'' میں ''نمائندہ'' یا بالفاظِ دیگر ''تیسرے شخص'' کے وجود کو بہرصورت لازمی قرار نہیں دیا گیا، بلکہ بعض صورتوں کو ''تیسرے شخص'' کی قید سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ پڑھیے:

''شریعت کی رو سے مرابحہ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمویل کار خود وہ چیز خریدے اور اپنے قبضے میں لائے یا یہ کام کسی تیسرے شخص کو اپنا وکیل بناکر اس کے ذریعے سے کرایا جائے، اس کے بعد وہ چیز کلائنٹ (مشتری) کو بیچی جائے، تاہم بعض استثنائی صورتوں میں جہاں کسی وجہ سے سپلائی کنندہ سے براہِ راست خریداری قابلِ عمل نہ ہو تو اس بات کی بھی اجازت ہے کہ وہ کلائنٹ کو اپنا وکیل بنادے، اور وہ اس کی طرف سے اس چیز کی خریداری کرے......الخ۔''(۱۰)

یہی بات ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں بھی موجود ہے۔ اور اسی بات کی طرف نظریاتی کونسل نے بھی اگرچہ اپنی رپورٹ میں اِن دبے اور مبہم الفاظ کے ساتھ: ''اور اس میں وہ شخص بھی شامل ہے جس کے لیے مال خریدا گیا ہے'' اشارہ کیا تھا، لیکن کھلے اور آزادانہ الفاظ میں اس کی

تصریح بعد والی کتابوں میں ملتی ہے۔

۲:- ''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ'' کے اجلاس میں دوسری یہ بات طے کی گئی تھی کہ خیراتی فنڈ بینک کی بجائے کسی ثالث کی تحویل میں رہے، لیکن مجلس کی روداد مرتب کرتے وقت یہ بات بھی لکھنے سے رہ گئی۔ چنانچہ روداد پڑھیے:

> ''بعض علمائے عصر نے اس مسئلے کے حل کے لیے یہ تجویز پیش کی ہے: عمیل سے عقدِ مرابحہ کرتے وقت یہ لکھوالیا جائے گا کہ اگر وہ ادائیگی کی اہلیت کے باوجود بروقت ادائیگی نہ کرسکا تو وہ اپنے واجب الاداء دَین کا ایک مخصوص فیصد حصہ ایک خیراتی فنڈ میں چندے کے طور پر ادا کرے گا۔ اس غرض کے لیے بینک میں ایک خیراتی فنڈ قائم کیا جائے گا جو نہ بینک کی ملکیت ہوگا اور نہ اس کی رقم بینک کی آمدنی میں شامل ہوگی، بلکہ اس سے ناداروں کی امداد اور ان کو غیرسودی قرضے فراہم کرنے کا کام لیا جائے گا۔''(۱۱)

دیکھئے کہ مذکورہ بالا عبارت میں ''ثالث کی تحویل'' کا تذکرہ نہیں ہے، اس لیے حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے روداد کے اس حصے پر یہ وضاحتی حاشیہ رقم فرمایا:

> ''مجلس کی تجویز تو یہ ہے کہ یہ فنڈ بینک کی بجائے کسی ثالث کی تحویل میں رہے، مگر بینک اپنی ہی تحویل میں رکھنے پر مصر ہے۔ ۱۲ رشید''(۱۲)

''اسلامی بینکاری کی بنیادیں'' نامی کتاب میں بھی اس قید کا لحاظ نظر نہیں آتا، چنانچہ دیکھئے:

> ''اس مقصد کے لیے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ مرابحہ کے عقد میں داخل ہوتے وقت عمیل یہ ذمہ داری قبول کرے کہ وقت پر عدم ادائیگی کی صورت میں وہ بینک کے انتظام میں چلنے والے ایک خیراتی فنڈ میں ایک متعین رقم جمع کرائے گا......الخ۔''(۱۳)

اہلِ نظر سمجھتے ہوں گے کہ بینک اس فنڈ کو اپنی ہی تحویل میں رکھنے پر کیوں مصرّ ہے؟

''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ'' کے اجلاس میں مرابحہ کے لیے جو طریق کار وضع کیا گیا تھا، اس میں اضافی باتوں کو پڑھنے کے بعد اب ہم اس کے بعد ''اسلامی بینکاری کی بنیادیں'' نامی کتاب میں مرابحہ مؤجلہ کا جو طریقۂ کار لکھا گیا ہے، اس کو دیکھتے ہیں کہ آیا اس میں کوئی نئی بات ہے یا نہیں؟

صفحہ: ۸۴ سے صفحہ: ۱۴۰ تک مرابحہ مؤجلہ پر جو تفصیل لکھی گئی ہے اور خاص کر طریقِ کار کے حوالے سے جو بحث مذکور ہے، اس میں ایسی کوئی قابلِ ذکر تبدیلی والی بات نہیں ملتی، تمام وہی باتیں ہیں جو گزشتہ صفحات میں ہم ''اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ''، ''بلاسود بینکاری، عبوری خاکہ'' اور ''مجلسِ تحقیقِ مسائلِ حاضرہ'' کی روداد میں پڑھ کر آئے ہیں۔ البتہ ایک کام ضرور کیا گیا ہے کہ مرابحہ کے

معروف طریقِ کار کو ’’پانچ مراحل‘‘ میں تقسیم کرکے ایک نئی صورت اور نئے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یا اسی پرانے مرابحہ کے نئے ہونے کا محض تأثر فراہم کیا گیا ہے۔ باقی بات وہی ہے جو ہم گزشتہ صفحات میں پڑھ کر آئے ہیں۔

## مرابحہ مؤجلہ بینکوں کا دل عزیز حیلہ کیوں ہے؟

مرابحہ کی اصل حیثیت اور بینکوں میں مرابحہ کے نام سے رائج مرابحہ کا طریقہ کار جان لینے کے بعد آگے ہم اس بات پر مختصر کلام کریں گے کہ مرابحہ کو حیلہ کیوں کہا جاتا ہے، حالانکہ مرابحہ تو درحقیقت بیع کی ایک قسم ہے؟ اور یہ کہ اسلامی بینک مرابحہ کو کیوں محبوب رکھتا ہے؟ اصل مثالی تمویلی طریقوں (شرکت و مضاربت) کو چھوڑ کر عبوری دور کے لیے پیش کردہ اس حیلے کو بینک کیوں دل عزیز رکھتا ہے؟

قارئین! اگر ہم ایک بات کو سمجھ لیں تو اُمید ہے کہ یہ سب سوالات حل ہوجائیں گے۔ وہ بات یہ ہے کہ بینک عالمی وضعی قانون کی رو سے زر کے لین دین کا ادارہ ہے، بینک تجارتی ادارہ نہیں ہے، اس لیے بینک براہ راست تجارت میں حصہ نہیں لیتا، اور نہ لے سکتا ہے۔ البتہ بینک تجارت تو نہیں کرتا، لیکن تجارت کے لیے سرمایہ داروں کو بطور سودی قرض کے رقم فراہم کرتا ہے۔ جب بینک کو اسلامی بنانے کی بات چلی تو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہم فوری طور پر اصل اسلامی مثالی تمویلی طریقے شرکت ومضاربت کو کیسے نافذ کریں؟ اس لیے کہ بینکاری کی روح وہ ’’سودی قرضوں کی فراہمی کی بنیاد پر سرمایہ کاری‘‘ ہے، جس کا خاصہ یہ ہے کہ غریبوں سے دولت لے کر امیروں کی جھولیوں میں ڈالی جائے، جب کہ اگر شرکت ومضاربت کو نافذ کیا جائے تو ان دونوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ غریب وامیر دونوں کو برابر سرابر حقِ محنت کی بنیاد پر حق دینے کے علمبردار ہیں، تو اس طرح تو سرمایہ کاری کی جس عمارت کو کھڑے کرنے میں مغرب کو ۴۰۰ سال لگے ہیں، ہم اس کو اتنی آسانی سے ایک دم سے کیسے ڈھا دیں؟ اس طرح کرنے سے تو ہماری معیشت ڈوب کر رہ جائے گی؟

اس مشکل کے حل کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل سے تین سال کی مدت کی مہلت طلب کی گئی اور کونسل سے گزارش کی گئی کہ تین سال کے لیے عبوری دور کے طور پر ہمیں ایسے طریقے بتائے جائیں کہ جن کے اپنانے سے ہم صریح سود کے مرتکب نہ ہوں اور بینکوں کی سرمایہ کاری کے نتیجے میں جو منافع روایتی بینکوں کے روایتی طریقۂ کار کے مطابق حاصل ہوتے ہیں، وہ منافع بھی ہمیں حاصل ہوں، ان منافع میں ذرا بھر کمی نہ ہو۔ تو اس پس منظر میں اس وقت کونسل نے تین سال کے عبوری دور کے لیے چند طریقے تجویز کیے جن میں سے ایک طریقہ مرابحہ مؤجلہ کا بھی ہے، جو درحقیقت روایتی سودی قرضے سے

سود کا لیبل ہٹا کر سودی قرضے پر اسلامی قلعی چڑھانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

دیکھئے! ''سودی قرضوں کی فراہمی'' کے لیے اسلامی بینکوں کو عبوری دور کے لیے عارضی متبادل کے طور پر جو طریقہ دیا گیا ہے وہ مرابحہ مؤجلہ کا طریقہ تھا، مرابحہ اگرچہ حقیقت میں بیع کی ایک قسم ہے، لیکن اس میں ''مؤجلہ'' کا تصور شامل کر کے اسے ''سودی قرضوں کی فراہمی'' کے ناجائز طریقے کی جگہ پر ایک جائز طریقے کے طور پر تمویل کاری کے لیے استعمال کیا گیا، اس لیے یہ حیلہ کے زمرے میں آتا ہے، اس لیے کہ اس طریقے سے سرمایہ دارانہ نظام کی روح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی وجہ سے یہ اسلامی مثالی طریقۂ تمویل نہیں ہے۔ اسی بناء پر اس کو حیلہ سے تعبیر کیا گیا اور اسی لیے بینک اس کو دل عزیز و محبوب رکھتا ہے۔ اس بات کے لیے کتابوں سے تائیدات پیشِ خدمت ہیں:

ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب فرماتے ہیں:

''مرابحہ کی جو بھی شکل رائج ہے وہ اپنے چند ظواہر سے قطع نظر اپنی روح اور نتائج کے اعتبار سے روایتی سودی کاروبار سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔''(۱۴)

اسلامی نظریاتی کونسل کی نظر ثانی کی رپورٹ میں ہے:

''ملک کے اسلامی حلقے اس امر کا حقیقی خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر نفع ونقصان میں شرکت (شراکت ومضاربت) کے لین دین میں سود کے بجائے مارک اپ (بیع مؤجل) کے طریقے کا وسیع پیمانے پر استعمال جاری رہا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سود کو حقیقی معنوں میں ختم کرنے کے بجائے صرف اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ مارک اپ کے تحت نفع ونقصان میں شرکت کا نظام، پرانے سودی نظام کو ایک نئے نام سے دوام بخشنے کی ایک صورت ہے .....اس لیے کہ مارک اپ (بیع مؤجل) کا نظام اپنے جوہر اور خصوصیات کے اعتبار سے سودی نظام سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔''(۱۵)

''مرابحہ بطورِ طریقۂ تمویل'' کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ لکھتے ہیں:

''یہ بات کسی صورت نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ مرابحہ اپنی اصل کے اعتبار سے طریقۂ تمویل نہیں ہے، یہ تو صرف سود سے بچنے کا ایک وسیلہ اور حیلہ ہے، ایسا مثالی ذریعۂ تمویل نہیں ہے جو اسلام کے معاشی مقصد کی تکمیل کرتا ہو۔ اس لیے معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے عمل میں اسے ایک عبوری مرحلے کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔''(۱۶)

''غیر سودی کاؤنٹرز'' کے نام سے لکھے گئے مقالے میں حضرت والا دامت برکاتہم ایک جگہ رقم طراز ہیں:

’’اگر چہ ٹھیٹھ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے سود میں داخل نہیں ہوتا، لیکن اس کے رواجِ عام سے سودخور ذہنیت کی حوصلہ افزائی ہوسکتی ہے، اس لیے یہ کوئی پسندیدہ طریق کار نہیں ہے۔‘‘(۱۷)

درج بالا عبارات کا حاصل درج ذیل ہے:

۱- مرابحہ مؤجلہ اپنی روح اور نتائج کے اعتبار سے روایتی سودی کاروبار سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

۲- مارک اپ (بیع مؤجل) کا نظام اپنے جوہر اور خصوصیات کے اعتبار سے سودی نظام سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

۳- اس سے اسلام کے معاشی مقصد کی تکمیل نہیں ہوتی۔

۴- رواجِ عام سے سودخور ذہنیت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر مرابحہ مؤجلہ کو حیلہ کہا گیا ہے۔ اور ان ہی خصوصیات کی بنا پر بینک اسے دل عزیز ومحبوب رکھتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مروجہ اسلامی بینک اور غیر اسلامی بینک کے درمیان حد فارق واضح نہیں ہو پا رہی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور اُمورِ دینیہ میں ذاتِ الٰہی اور مسئولیتِ اخروی پر رہنے، لکھنے، پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

## حواشی وحوالہ جات

۱:- اسلامی نظریاتی کونسل رپورٹ، ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، ص:۲۸، ۲۹
۲:- تفصیل کے لیے: بلاسود بینکاری، عبوری خاکہ، ڈاکٹر محمد طاہر القادری، ص:۶۳ تا ۶۹
۳:- بلاسود بینکاری، عبوری خاکہ، ڈاکٹر محمد طاہر القادری، ص:۶۴
۴:- ماخذ سابق، ص:۶۸
۵:- بلاسود بینکاری، عبوری خاکہ: ۶۸-۶۹
۶:- تفصیل کے لیے: احسن الفتاویٰ، ج:۷، ص:۱۱۹ تا ۱۲۱ ملاحظہ ہو۔
۷:- اسلامی نظریاتی کونسل رپورٹ، ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، ص:۲۹
۸:- احسن الفتاویٰ، ج:۷، ص:۱۱۹
۹:- حوالہ سابقہ
۱۰:- اسلامی بینکاری کی بنیادیں، ص:۹۴-۹۵
۱۱:- احسن الفتاویٰ، ج:۷، ص:۱۲۰-۱۲۱
۱۲:- سابقہ حوالہ
۱۳:- اسلامی بینکاری کی بنیادیں، مفتی محمد تقی عثمانی، ص:۱۲۴
۱۴:- اسلامی بینکاری ایک تعارف، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ص:۱۷۱
۱۵:- اسلامی نظریاتی کونسل رپورٹ، ص:۹۶
۱۶:- اسلامی بینکاری کی بنیادیں، ص:۹۳
۱۷:- فقہی مقالات، ج:۲، ص:۲۵۹

# مدینہ منورہ کے ایک نامور محدث کی رحلت

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

## حضرت مولانا حبیب اللہ قربان مظاہری رحمۃ اللہ علیہ

(۱۳۶۳ھ-۱۴۴۱ھ) = (1943ء-2020ء)

۱۹ رجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۴ مارچ ۲۰۲۰ء کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خادمِ خاص وشاگردِ رشید حضرت مولانا حبیب اللہ بن قربان علی مظاہری مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مدینہ منورہ میں زندگی کی اٹھہتر بہاریں دیکھ کر راہیِ سفرِ آخرت ہوگئے۔

### تعلیم وتربیت

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے شمال میں واقع صوبہ ''بہار'' کے شہر ''چمپارن'' سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کی سرکاری تعلیم گاہ اور مقامی دینی درس گاہ میں حاصل کرنے کے بعد ''سہارن پور'' تشریف لے گئے اور جامعہ مظاہرعلوم سہارن پور سے ۱۳۹۰ھ میں درسِ نظامی کی تکمیل کی، ان کے اساتذۂ حدیث مولانا محمد یونس جون پوری (صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطأ مالک بروایتِ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ)، مفتی مظفرحسین (سنن ترمذی، شمائل ترمذی اور علل صغیر)، مفتی محمد یحییٰ رحمہم اللہ اور مولانا سید محمد عاقل مدظلہم (سنن اَبی داود، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور موطأ مالک بروایتِ امام یحییٰ لیثی رحمۃ اللہ علیہ) نمایاں ہیں۔ دورانِ تعلیم اور حرمین شریفین کے اسفار میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں کے حاضر باش رہے، رمضان سنہ ۱۴۳۹ھ کے آخری عشرہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی تو اس موقع پر خود فرمایا:

''میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ بخاری میں کافیہ سے جلالین تک چار سال شریک رہا ہوں، شیخ کا ہی نام سن کر سہارن پور پہنچا تھا، داخلہ کے بعد میں تو ''ھدایۃ النحو'' اور ''نور

**الإیضاح**'' وغیرہ پڑھتا تھا، لیکن بھاگ کر جاتا اور حضرت شیخ کے درسِ بخاری میں اہتمام سے شریک ہوتا تھا، حالانکہ جب میں ''کافیہ'' میں داخل ہوا تو میری عمر گیارہ سال تھی، لیکن غور سے سنتا تھا، اور اس ڈر سے پیچھے چھپ کر بیٹھتا تھا کہ شیخ یہ نہ پوچھ لیں: یہ چھوٹا سا لڑکا کون بیٹھا ہے؟ اور یہ بھی مجھے یاد ہے کہ کس حدیث پر شیخ نے کیا فرمایا تھا؟ شاید ان بخاری پڑھنے والوں کو یاد نہ ہو، لیکن مجھے یاد ہے۔''

فراغت کے بعد حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کے زمانہ میں دیگر امور کے ساتھ شیخ کی جانب سے خط و کتابت کی ذمہ داری مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ذمہ ہوتی تھی، حضرت شیخ کی آپ بیتی اور مکاتیب کے مختلف مجموعوں کے آخر میں جا بجا بقلم حبیب اللہ کا مصداق مولانا ہی تھے، ایک نجی مجلس میں مولانا نے فرمایا:

''حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہتے ہوئے بارہ برسوں میں لگ بھگ پچاس ہزار خطوط تو لکھے ہوں گے، ان خطوط کی مختلف نوعیتیں ہوتی تھیں، حضرت شیخ تمام ڈاک سنتے تھے، پھر بعض خطوط کا جواب لکھنا میرے ذمہ فرمادیتے تھے، بعض کے متعلق مجھے کچھ اشارات بیان فرماتے اور میں ان کا مضمون مرتب کرلیتا تھا، اکثر خطوط ان دو قسموں کے ہوتے تھے، جبکہ کچھ ایسے خالص علمی خطوط ہوتے تھے، جن کے جوابات حضرت املا کرواتے تھے اور بعض اوقات یہ جوابات مفصل اور کئی کئی صفحات پر مشتمل ہوتے تھے۔''

بہرکیف اس دورانیے میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے خوب علمی و روحانی فیض حاصل کیا، شیخ کی رحلت کی بعد مولانا' مدینہ منورہ میں ہی مقیم ہوگئے اور ابتدائی دور میں ''**مکتبۃ الإیمان**'' کی مشغولیت رہی، لیکن بعد ازاں خود کو صرف کتبِ حدیث پڑھنے پڑھانے اور علومِ حدیث کے مطالعہ وتحقیق کے لیے یکسو کرلیا، اس طویل قیام کے دوران ایک سال حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ، مولانا محمد یحییٰ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر کراچی میں ان کے ادارے ''**معھد الخلیل الإسلامي**'' میں تدریسِ حدیث کے لیے تشریف لائے تھے، اس کے علاوہ مختلف اداروں کی جانب سے مشیختِ حدیث کی دعوتوں کے باوجود مدینہ منورہ میں قیام کو ترجیح دی اور دیارِ حبیب میں ہی عالمِ عرب و دیگر مسلم ممالک کے اہلِ علم وطلبائے علم ان سے حدیث پڑھتے اور مولانا اجازتِ حدیث سے نوازتے رہے۔ ان اہلِ علم میں شیخ حامد اکرم بخاری (مدرسِ مسجدِ نبوی)، شیخ احمد عاشور، ڈاکٹر حمزہ بکری، شیخ وائل حنبلی، شیخ عبد الرحمٰن نمنکانی اور شیخ حسین شکری حفظہم اللہ وغیرہ نمایاں ہیں۔

## عرب علماء کی نظر میں

ا:- شامی محدث اور محقق عالم، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد، شیخ مجد مکی حفظہ اللہ

(حال مقیم قطر) کا مولانا سے قدیم تعلق رہا ہے، شیخ مجد نے لکھا ہے:

''شیخ حبیب اللہ قربان کے ساتھ میرا تعارف رمضان سنہ ۱۴۰۰ء میں مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد ہوا، مدینہ منورہ میں محدث محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں شیخ سے بھی ملاقات رہتی تھی، اس دور میں مدینہ منورہ کا ''مکتبة الإيمان'' جب شیخ کے ہاتھ آیا تو ہمارا تعلق مزید مستحکم ہوگیا، ''مکتبة الإيمان'' اس زمانے میں مدینہ منورہ کے اہم کتب خانوں شمار ہوتا تھا، جہاں مختلف ممالک کی مطبوعات مہیا ہوتی تھیں، میں کتب خانہ میں وقتاً فوقتاً مولانا سے ملتا، شیخ بکثرت اللہ عزوجل کا ذکر کرتے تھے، زبان یادِ الٰہی سے تر رہتی، خرید وفروخت میں نرم خُو تھے، میں اس دورانیہ میں بیروت کے مشہور کتب خانے ''دار البشائر الإسلامية'' کی جانب سے مدینہ منورہ میں وکیل تھا، جب کبھی شیخ سے کتابوں کی خرید وفروخت کا معاملہ ہوتا تو شیخ ادائیگی طے شدہ وقت پر فرماتے تھے۔ اس دوران شیخ کی معیت میں بہت سے مشائخ سے حرمین میں ملاقاتیں رہی ہیں۔''

۲:- شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہی ایک اور شاگرد ڈاکٹر ماجد درویش حفظہ اللہ (طرابلس، لبنان) لکھتے ہیں:

''ایک بار سنہ ۱۹۹۵ء میں، میں نے شیخ حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ کی کتاب ''أثر الحديث الشريف في اختلاف الفقهاء'' کے نسخے خریدے، جب شیخ کو علم ہوا کہ میں اپنے طلبا کے لیے یہ نسخے خرید رہا ہوں تو انہوں نے ان کتب کی قیمت وصول کرنے سے انکار کردیا اور اپنی طرف سے بطورِ ہدیہ کتابیں مرحمت فرمائیں۔''

۳:-- فلسطینی عالم استاذ سالم حفظہ اللہ، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رہے ہیں، مدینہ منورہ میں قیام کے دوران مولانا کی مجلسوں میں حاضر ہوکر استفادہ کرتے تھے، مولانا کی اتباع میں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے تبرک کی نیت سے اپنے بیٹے کا نام بھی ''حبیب اللہ'' رکھا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''ایک بار میں نے مولانا سے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی مقام کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا:

''امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑے محقق و مدقق تھے، حافظ متسرّع ہیں۔''

ان کے بقول مولانا فرماتے تھے:

''تصوف خوابوں کا نہیں، عمل کا نام ہے، بہت سے لوگ خوابوں سے دھوکہ کھاتے ہیں اور یوں شیطان کا کھلواڑ بن جاتے ہیں۔''

انہی کی روایت ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

''اگر کسی شخص کو کوئی مربی شیخ نہ ملے تو وہ روزانہ اہتمام سے روزانہ ایک ہزار بار درود شریف پڑھے، اللہ تعالیٰ اسے سیدھی راہ پر گامزن رکھیں گے اور آسانی سے مربی تک پہنچ ہوجائے گی۔''

۴:- شامی محقق ڈاکٹر حمزہ بکری حفظہ اللہ (حال مقیم ترکی) کا مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رجب ۱۴۲۷ھ سے تعلق رہا ہے، انہوں نے مولانا سے ''موطأ إمام مالک'' بروایتِ یحییٰ لیثی رحمۃ اللہ علیہ دس روز میں پڑھی، اس کے علاوہ کئی کتبِ حدیث پڑھیں اور اجازتِ عامہ حاصل کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''(۱۴۲۷ھ کی مجلسوں میں) شیخ نے میرے لیے یومیہ دو گھنٹہ مخصوص کر رکھے تھے، نویں دن میں نے بتایا کہ کل میرا مکہ مکرمہ کا سفر ہے، جبکہ کتاب ابھی ختم نہیں ہوئی۔ شیخ نے فرمایا کہ کل صبح چھ بجے آجانا؛ تاکہ نمازِ ظہر سے قبل ہم کتاب پوری کرلیں؛ کیونکہ ظہر کے فوراً بعد میرا سفر تھا، اگلے روز میں چھ بج کر پانچ منٹ پر پہنچا تو دروازہ کھولتے ہی شیخ نے عتاب آمیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا: کیا یہ چھ بجے کا وقت ہے؟ پھر الحمد للہ اسی روز ظہر سے پہلے ہماری کتاب مکمل ہوگئی۔

اگلے برس ۱۴۲۸ھ میں، میں نے شیخ سے ''کتاب الآثار'' بروایت امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ پڑھی اور تعلق مزید مضبوط ہوگیا، شعبان ۱۴۳۱ھ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الشمائل المحمدیة'' پڑھی اور ۱۴۳۴ھ میں کتبِ ستہ کے اوائل سے لگ بھگ بیس احادیث پڑھیں۔ بس یہی ہماری آخری ملاقات تھی۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ نہایت متواضع، بااخلاق اور مربی تھے، وعدے کے پابند تھے، زمینی فرش پر بیٹھتے، اردگرد کتابیں ہوتیں، اطراف سے آنے والے طلبائے علم کو کتبِ حدیث پڑھانے میں دن گزارتے، وقت ملتا تو کسی کتاب کے مطالعہ، کسی مسئلہ کی تحقیق یا کسی حدیث کی تحقیق میں مصروف رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوی حافظہ عطا فرمایا تھا، جب میں ان کے سامنے کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا تو خواہ لغوی ولفظی غلطی ہوتی یا راویوں کے ناموں میں، شیخ اپنے حافظہ کی مدد سے تصحیح فرمادیتے، میں جب تک (عبارت) صحیح پڑھتا جاتا خاموش رہتے، حالانکہ ان کے علم میں ایسے فوائد تھے کہ ہر حدیث کی تشریح وتوضیح پر گفتگو کرسکتے تھے، البتہ بعض اوقات میں خود رک کر کسی مناسبت سے کچھ پوچھتا تو شیخ اپنے کلام سے فیضیاب فرماتے۔''

## ذوقِ کتب

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو کتابوں کے حصول وخریداری اور ان کے مطالعہ وتحقیق کا بے حد شوق وذوق

تھا، ہر وقت کتابوں کی جستجو میں رہتے، مختلف اطراف میں چھپی کتابوں کے متلاشی رہتے، بلاشبہ مولانا کتابوں کے عاشق تھے، خاص طور پر صحیح بخاری سے متعلق ہر کتاب انہیں مرغوب تھی، مولانا فرماتے تھے:

''علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے صحیح بخاری کی شرح ''عمدۃ القاری'' کی ''المکتبة المنيرية (مصر)'' کی طباعت میں نے تیس برس قبل سات سو ریال میں خریدی تھی۔''

تیس برس قبل ایک کتاب کے لیے اتنی رقم کافی زیادہ شمار ہوتی تھی، گویا کتابوں کے سلسلے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک وہی تھا جو کسی شاعر نے بیان کیا ہے:

جمادے چند دادم جاں فریدم
بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

یعنی ''میں نے چند ٹھیکریوں (روپوں) کے عوض عزیز از جاں شے حاصل کر لی ہے، شکر ہے کہ یہ سودا ارزاں ہے، گھاٹے کا نہیں۔''

## اہم علمی کارنامے

۱:- اپنے استاذ مولانا سید محمد عاقل مدظلہم کی ترتیب دی ہوئی کتابوں ''الحلّ المفهم لصحيح مسلم'' اور ''الفيض السمائي على سنن النسائي'' کی ترتیب میں ان کی معاونت فرمائی۔

۲:- علامہ محمد بن رسول بَرزَنجی حسینی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۰۳ھ) کی کتاب ''الإشاعة في أشراط الساعة'' کی اشاعت کا اہتمام کیا، اس کتاب پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مفید تعلیقات ہیں، جن سے کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے، حضرت شیخ نے مولانا کو اپنی تعلیقات پر مشتمل نسخہ مہیا فرمایا اور مولانا نے انہیں ترتیب دے کر شائع کیا۔

۳:- حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی فضائلِ درود شریف کا عربی ترجمہ کیا، یہ کتاب عنقریب چھپ کر عام ہوگی۔

۴:- صحیح بخاری پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات، حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ''لامع الدّراري'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب پر کافی عرصہ سے تحقیقی کام کر رہے تھے اور آخر تک اسی میں مشغول رہے، خاص طور پر کتاب کے مقدمہ پر ان کے قیمتی اضافات اور گراں قدر تعلیقات ہیں، جن کی کچھ تفصیل ان کی زبان سے سنی ہے اور پیشِ نظر تحریر کا حصہ ہے، اللہ کرے کہ مولانا کی یہ مفید حدیثی خدمت جلد منظرِ عام پر آئے اور ان کی روح کی مزید آسودگی کا باعث بنے۔

۵:- ''كشف الأستار عن زوائد البزار'' علامہ نور الدین ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کی معروف کتاب

ہے، جو محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے ساتھ چار جلدوں میں چھپی ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے کام شروع کیا اور دو جلدوں پر ان کا کام مکمل ہو چکا تھا، برادرم مولانا محمد مظاہری حفظہ اللہ کے مطابق یہ دو جلدیں بھی جلد چھپ جائیں گی، ان شاء اللہ!

۶:- تواریخ مدینہ کی چند کتابوں پر بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا کام ہے، جو ان کے شاگرد شیخ حسین شکری کے نام سے چھپی ہیں۔

۷:- ''الدر المنضود شرح سنن أبی داؤد'' مولانا محمد عاقل صاحب مدظلہم کی اردو شرح ہے۔ اس شرح میں مولانا بھی اپنے استاذ محترم کے معاون رہے ہیں اور کتاب پر ان کے بعض قیمتی اضافات ہیں، جو انہی کی نسبت کے ساتھ چھپے ہوئے ہیں۔

۸:- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب شائع شدہ ہے۔

## چند علمی افادات

مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے چند ہی مجلسیں رہیں، ان مجلسوں میں ان کے خوانِ علم سے جو بکھرے موتی چنے، ان میں سے بعض فوائد، افادہ عام کی غرض سے ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

۱:- انگوٹھی کے متعلق فرمایا: ''یہ آج کل سنتِ متروکہ بن گئی ہے (۱)، علماء بھی نہیں پہنتے، حالانکہ بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چھے انگوٹھیوں کا ذکر ہے، اس سلسلے میں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا مستقل رسالہ ''جزء الخاتم'' بھی ہے اور میرے مطالعہ اور یاد کے مطابق (ہوسکتا ہے کہ اس سے زیادہ ہوں) حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ انگوٹھیاں تھیں۔ مہر کے کے لیے صرف ایک انگوٹھی تھی، اس کے علاوہ بھی گیارہ تھیں، جبکہ بخاری شریف میں ہی اس کے علاوہ پانچ انگوٹھیوں کا ذکر ہے۔

ایک روایت میں ہے: ''فَصُّهُ حَبَشِيٌّ .'' (سنن ابوداود: ۴۲۱۶) یعنی کالا پتھر تھا، جس کو سلطانی پتھر کہتے ہیں اور بادشاہ و امراء پہنتے ہیں، موجودہ سعودی فرماں روا شاہ سلمان اور حرم کے ایک امام بھی پہنتے ہیں۔ شراح نے یہاں ''حبشی پتھر'' لکھا ہے، حالانکہ ''حَبَش'' نامی جگہ ہے، جو ''یمن'' میں ہے، جہاں سے پتھر نکلتے ہیں، یہ وہ ''حبشہ'' نہیں ہے۔ یہ بات مجھے پڑھنے کے دوران سمجھ نہیں آئی تھی، بعد میں سمجھ میں آئی۔

۲:- ایک ہی راوی کے متعلق بعض اوقات ائمہ جرح و تعدیل کے مختلف جوابات ہوتے ہیں، مولانا نے فرمایا: ''بعض اوقات یہ مختلف روایات، مختلف اسئلہ کی بنا پر ہوتی ہیں، مثلاً: ایک ہی راوی

---

**حاشیہ: (۱)......** یہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق تھی، عام فقہاء اہلِ افتاء کی رائے کے مطابق مردوں کے لیے انگوٹھی پہننے کا حکم یہ ہے کہ ایک مثقال (ساڑھے چار ماشے یعنی ۴ گرام اور ۳۷۴ ملی گرام) [4.374] سے کم وزن کی چاندی کی انگوٹھی یا چھلا پہننا جائز ہے، چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں، البتہ عام آدمی کے لیے چاندی کی انگوٹھی بھی نہ پہننا بہتر اور افضل ہے۔ (سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب من کرہہ، رقم الحدیث: ۴۰۴۹ اور رد المحتار، ج: ۶، ص: ۳۶۲-۳۶۳)

کے متعلق ایک موقع پر کہہ دیتے ہیں: ''فلانٌ ثقةٌ'' اور دوسرے موقع پر کہتے ہیں: ''لا بأس به''.

۳- ''امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ''لا بأس به'' کا مطلب ''ثقة'' ہی ہے، ان کے ہاں (حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی) ''تقریب التھذیب'' والا معنی مراد نہیں ہوتا۔ ائمہ کے درمیان بھی ان اصطلاحات میں کافی فرق ہے، کسی کے نزدیک ''لا بأس به'' ثقاہت کے لیے ہے اور کسی کے نزدیک ضعف کا ایک درجہ ہے۔''

۴- شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرمایا: ''ان کے ہاں احادیث پر حکم لگانے کی بنیادیں ''تقریب التھذیب''، ''لسان المیزان'' اور ''میزان الاعتدال'' ہیں، میرے نزدیک محض ان کتب کی بنیاد پر حکم لگانا جائز نہیں۔ خود ان کے تلامذہ نے ان کی اغلاط پر رد لکھے ہیں اور کئی ردود آ چکے ہیں۔''

۵:- ''آج کل میرا سارا ذہن ''لامع الدَّراريّ'' کی طرف ہے، ''لامع الدَّراريّ'' میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمہ کا آخری باب ہے: ''ما أُلِّف حولَ الجامع الصحيح'' یعنی صحیح بخاری کے متعلق لکھی گئی کتابیں، اس میں ہمارے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سو چھبیس (۱۲۶) کتابوں کا ذکر کیا ہے، مولانا عبدالسلام مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''سیرۃ الإمام البخاري'' (میں ایک سو چھیالیس (۱۴۶) کا تذکرہ کیا ہے، اس میں متفرق زبانوں کے تراجم کا بھی ذکر کیا ہے۔) میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے تین نمبروں پر تنقید کی ہے، میرے شیخ نے جہاں سے نقل کیا ہے، ان سے غلطی ہوئی ہے، غلطی پر تنبیہ کر کے درست بات ذکر کر دی ہے۔ مولانا مبارک پوری سے بھی کئی غلطیاں ہوئی ہیں۔ حضرت شیخ کی ایک سو چھبیس (۱۲۶) پر میں نے دو ہزار (۲۰۰۰) ناموں کا اضافہ کیا ہے اور شیخ کے ہاں متفرق غیر مرتب تذکرہ تھا، میں نے بیالیس (۴۲) ابواب قائم کیے ہیں اور ان ابواب میں سے ہر باب کے تحت بتایا ہے کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں؟ اور بخاری شریف کے متعلق تین سو زیادہ کتابیں میرے پاس ہیں۔

ان ابواب میں سب سے پہلے رواۃِ بخاری کو لیا ہے، پھر روایاتِ بخاری اور اس کے بعد نسخِ بخاری کا ذکر ہے۔ بخاری کے سامعین تو نوے ہزار سے زیادہ ہیں، لیکن جن سے بعد میں روایت چلی ہے وہ صرف رواۃ چار ہی ہیں، ساتویں صدی ہجری سے محاملی کو پانچواں راوی قرار دینے کی غلطی چلی آ رہی ہے، اس پر اہم رد لکھا ہے کہ محاملی رحمۃ اللہ علیہ سامع تھے، راوی نہیں تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ آخری بار بغداد گئے تو ''الجامع الصحيح'' ان کے پاس نہیں تھی، اس موقع پر انہوں نے محدثین کے طریقے کے مطابق اپنے حفظ سے احادیث بیان کیں، ان میں سے بعض احادیث وہی ہیں جو بخاری شریف میں ہیں، سامعین میں محاملی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے بھائی اور دیگر لوگ بھی تھے، اس کو لے کر محاملی رحمۃ اللہ علیہ کو راوی قرار دے دیا گیا اور یہ غلطی پہلے شیخ الحرم امام طبری رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی اور اب تک چلی آ رہی ہے، میں نے بتایا

ہے کہ محاملی سامعین میں سے تھے، راوی نہیں تھے، ورنہ تو ان کے بھائی کو بھی راوی قرار دے دینا چاہیے، ان کو تو کوئی بھی راوی نہیں کہتا۔ اس کے ساتھ لکھا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر کتابوں ''التاریخ الکبیر، التاریخ الأوسط، التاریخ الصغیر، الأدب المفرد اور خلق أفعال العباد'' کے راوی کون کون ہیں؟ ان میں سے بعض ''الجامع الصحیح'' کے بھی راوی ہیں اور بعض صرف انہی کتابوں کے راوی ہیں، بخاری کے نہیں۔

پھر نسخوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ہم نے لکھا ہے کہ بخاری شریف کے تیس نسخے ہیں، جیسے یونینی اور عبداللہ بن سالم بصری کے نسخے مشہور ہیں، اب تک بخاری شریف کا آخری نسخہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ نسخہ کی تعریف کسی نے نہیں کی کہ نسخہ کسے کہتے ہیں؟ ہر منسوخ چیز کو نسخہ نہیں کہا جاتا، ہم نے یوں تعریف کی ہے: ''نسخہ وہ ہوتا ہے کہ جس کے لکھے جانے کے بعد عرصہ دراز تک کاتب اس میں مشغول رہے، دیگر نسخوں کا پتہ چلے کہ ان کے ساتھ اس کا تقابل کرے اور فروق کو ذکر کرے، یعنی جس نسخہ کے ساتھ کاتب کا بہت اعتنا رہا ہو۔'' جیسے عبداللہ بن سالم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نسخہ کے ساتھ بیس سال تک اعتنا کیا ہے اور فروق کو حواشی میں ذکر کرتے رہے، یونہی یونینی نے بھی اپنے نسخے کا بیس سال سے زیادہ اعتنا کیا ہے۔

بخاری شریف کے سب سے بڑے راوی امام فِرَبری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، لیکن وہ صاحبِ نسخہ نہیں ہیں، حالانکہ بخاری شریف کی اصل انہی کی پاس پہنچی ہے، جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تالیف کی تھی، اللہ کرے کہیں مل جائے، انہوں نے تین بار امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف سنی ہے۔''

۲:- اسی موقع پر دعا کے بعد فرمایا: ''ہمارے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ جب دعا کراتے تھے تو اتنا سنا جاتا تھا کہ شروع میں ''سبحانک اللّٰھم'' کہتے تھے اور آخر میں ''وصلی اللّٰہ وسلم...''، درمیان میں آہستہ دعا فرماتے تھے، میں بھی شیخ کے انداز پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ایک دعا بآواز پڑھ لیتا ہوں، ہمارے حضرت شیخ نے بعد میں ایک حدیث اہتمام سے چھپوائی تھی، ''سننِ ترمذی'' میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دعائیں کیں، ہمیں ان میں سے کچھ بھی یاد نہ رہا، ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے بہت دعائیں کیں، لیکن ہمیں کچھ بھی یاد نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں ایسی دعا نہ بتاؤں جو ان سب کی جامع ہو؟ یوں دعا کرو:

''اَللّٰھُمَّ إِنَّا نَسْأَلُکَ مِنْ خَیْرِ مَا سَأَلَکَ مِنْهُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَنَعُوذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْهُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَأَنْتَ الْمُسْتَعَانُ، وَعَلَیْکَ الْبَلَاغُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.''

یہ ساری دعاؤں کی جامع دعا ہے۔ بعض حضرات اس دعا میں ''وَعِبَادُکَ الصَّالِحُوْنَ'' کا

اضافہ کرتے ہیں، یہ اضافہ حدیث میں نہیں ہے، لیکن جائز ہے اور زائد ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو سب کو جامع ہیں تو ''**عبادُک الصالحون**'' کو بھی جامع ہیں۔''

۷:- فرمایا: امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''**ما له فيه ذوق المحدثين.**'' (تاریخ الإسلام، ترجمۃ ابن الجوزی)

۸:- ''ابن شاہین رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے فقہاء کے مذاہب ذکر کیے جاتے تو کہا کرتے تھے: ''**أنا محمدي المذهب**''، اس پر حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں محمد بن عمر داودی کا بیان نقل کیا ہے: ''**كان لا يعرف من الفقه لا قليلا ولا كثيرا**'' (تاریخ الإسلام، ترجمۃ ابن شاہین)

۹:- مولانا نے فرمایا: ''کسی عالم کی دوسرے عالم کے متعلق رائے پر اعتماد کے لیے میری نظر میں تین شرائط ہیں: ۱:- معاصرت، ۲:- معاشرت، ۳:- ملازمت۔''

## مولانا مظاہری رحمۃ اللہ علیہ اور چند کتبِ حدیث کی طباعت

مولانا مرحوم، مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''**کشف النقاب عما یقوله الترمذی: وفي الباب**'' کے نہایت قدر دان تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں اس کتاب کی پانچ جلدیں چھپی تھیں، شہادت کے بعد معروضی احوال کی بنا پر یہ کام رک گیا تھا، ''**كُلُّ أَمْرٍ مَرْهُوْنٌ بِوَقْتِه**'' کے بمصداق ہر کام اپنے وقت پر ہی ہوتا ہے اور اس کے لیے اسباب و ماحول بھی ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں، کچھ عرصہ قبل جب جامعہ میں یہ کام دوبارہ شروع ہوا تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی خبر پہنچی، کیا خبر کہ علمِ حدیث کے شغف کے ساتھ ناموں کے اشتراک کو بھی دخل ہو کہ مولانا حبیب اللہ قربان، مولانا حبیب اللہ مختار رحمہما اللہ کی تحقیقی کاوش کے منظرِ عام پر آنے کے لیے فکرمند ہوگئے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بندہ سے رابطہ فرما کر اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش فرمائیں اور اس کی طباعت کی جانب اپنے بعض متوسلین کو متوجہ فرمایا، رمضان سنہ ۱۴۳۹ھ کے آخری عشرہ میں مدینہ منورہ میں جامعہ کے بعض اساتذہ کی معیت میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش گاہ میں حاضری ہوئی تو اس موقع پر بندہ نے مولانا سے اس کام کی تکمیل کے لیے دعاؤں کا عرض کیا، مولانا فرمانے لگے: ''میں دعاؤں اور دواؤں سب کے لیے تیار ہوں۔'' پھر فرمایا: ''میں ملاقات اور فون پر بات صرف صبح دس سے بارہ کے درمیان کرتا ہوں، بقیہ اوقات میں نہ کسی سے ملاقات کرتا ہوں اور نہ کسی سے فون پر بات کرتا ہوں، اپنے (علمی و تحقیقی) کاموں میں مشغول رہتا ہوں، لیکن اس کتاب کے سلسلے میں نے کہہ رکھا ہے کہ دن رات میں جس وقت چاہو فون کرلو۔'' پھر فرمایا: ''اصل کام تو آگے (تکملہ) کا ہے۔''

موصوف رحمۃ اللہ علیہ چند کتابوں کی طباعت کے لیے نہایت فکرمند تھے:

ا:-''کشف النقاب''اوراس کا تکملہ،۲:-''نشر الأزهار شرح معاني الآثار ''مولانا محمد امین اورکزئی رحمۃ اللہ علیہ اوراس کا تکملہ،۳:-''الاتحاف لمذهب الأحناف''یعنی مولانا ظہیراحسن نیموی رحمۃ اللہ علیہ کی''آثار السنن''پرمولانا محمد انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے گراں قدر حواشی،اور۴:-''معارف السنن شرح سنن الترمذي''کا طبع جدید اور تکملہ۔اس مجلس میں بھی اور دیگر مختلف مواقع پر ان کتابوں کی طباعت کی جانب توجہ دلاتے رہے،اپنی جانب سے مادی وروحانی تعاون کی یقین دہانی کراتے رہے اور متوسلین کو بھی اس جانب متوجہ فرماتے رہے۔الحمد للہ! جامعہ میں ان کتابوں پر کام جاری ہے۔الحمدللہ''کشف النقاب''کی مزید چار جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور نو جلدوں میں صرف ''أبواب الطهارة''اور''أبواب الصلاة''مکمل ہوئے ہیں،دسویں اور گیارہوں جلد بھی ان شاء اللہ! جلد ہی شائع ہوجائے گی۔''الإتحاف''پر بھی کام جاری ہے،جو ان شاء اللہ کچھ عرصہ میں منظر عام پر آجائے گا اور باقی کتب بھی ان شاء اللہ! یکے بعد دیگرے سامنے آئیں گی۔دیگر حسنات کے ساتھ یہ نیکی بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نامۂ اعمال میں درج ہوگی۔

## وفات وتدفین

بروز ہفتہ،بتاریخ ۲۰ رجب ۱۴۴۱ھ بعد نمازِ فجر مسجدِ نبوی-علٰی صاحبہٖ آلاف آلاف تحیات و تسلیمات-میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور بقیع میں تدفین ہوئی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ادریس بن عبدالقادر مدنی کی روایت ہے: مجھے''حديث الرحمة'' سنا کر فرمایا:''میں نے اپنے شیخ محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی سے یہی حدیث ابتدا میں سنی،شیخ بقیع میں مدفون ہیں،مجھے امید ہے کہ میں بھی بقیع میں دفن ہوں گا۔''

مولانا کی امید بَر آئی اور ساری زندگی جس نبی کی احادیث کے گیت گاتے رہے،اب انہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں تا قیامِ قیامت آرام فرما ہیں۔مولانا نے پسماندگان میں ایک صاحبزادہ اور دو صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔برادرم مولانا محمد مظاہری حفظہ اللہ نے ابتدائی کتب مولانا سے پڑھی ہیں،بعد ازاں جامعہ مظاہر علوم قدیم وجدید دونوں سے فیضیاب ہوئے ہیں،البتہ درسِ نظامی کی تکمیل جامعہ مظاہر علوم جدید سے کی ہے۔مولانا کے علمی ذخیرے کو برادر موصوف ہی سنبھالے ہوئے ہیں اور ان کی اشاعت کی ذمہ داری بخوبی نبھا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی کامل مغفرت فرمائے اور ان کے علوم وفیوض کو تا قیامت جاری رکھے،ان کے صاحبزادے برادرم مولانا محمد مظاہری اور دیگر اہل خانہ کو صبرِ جمیل نصیب فرمائے،آمین!

# خانوادۂ کامل پوریؒ کے عظیم فرزند کی رحلت

مفتی خالد محمود
نائب مدیر اقرأ روضۃ الاطفال ٹرسٹ

## حافظ محمد سفیان انور رحمۃ اللہ علیہ

خانوادۂ کامل پوریؒ اور خاندان بنوریؒ کی نسبتوں کے حامل، محبوب العلماء، اکابر کے منظورِ نظر، علماء و مشائخ کے خادم، مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ کے پڑپوتے، مولانا عبیدالرحمٰن کے پوتے، امامِ اہلِ سنت حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ کے نواسے، بھائی حافظ محمد انور کی آنکھوں کے تارے، قدسیہ باجی کے راج دلارے، بھائی بہنوں کے پیارے، الحاج عبدالمنان مکی کے خلیفہ مجاز، نیک صالح جوان حافظ محمد سفیان انورؒ مؤرخہ ۷ مارچ ۲۰۲۰ء بروز ہفتہ شیفیلڈ (برطانیہ) میں وہاں کے وقت کے مطابق تقریباً ۹ بجے اپنی بیماری سے لڑتے لڑتے زندگی کی بازی ہار گئے اور اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ گئے، إنا للّٰه و إنا إليه راجعون.

حافظ محمد سفیان انور اپنی زندگی کی صرف ۳۶ بہاریں ہی دیکھ پائے اور نوجوانی کے عالم میں صرف چھتیس سال کی عمر میں دعوتِ حق کو لبیک کہا اور صرف اپنے گھرانہ کو ہی نہیں بلکہ پورے خاندان، عزیز و اقارب سمیت ہزاروں محبت کرنے اور تعلق رکھنے والوں کو رنجیدہ کر گئے۔ موت کوئی اچھنبا نہیں، ہر شخص نے موت کا مزا چکھنا ہے، جو بھی دنیا میں آیا ایک دن اس نے جانا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ سفیان طویل عرصہ سے عارضہ میں مبتلا تھے اور یہ مرحلہ آنا ہی تھا، لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا جلد سب کو روتا ہوا چھوڑ جائے گا، اس لیے اب تک ان کی موت کا یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے:

سفیان جان سے گیا ہے یقیں نہیں آتا — وہ اس جہاں سے گیا ہے یقیں نہیں آتا
کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی — کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

بھائی سفیان نجیب الطرفین تھے، کیونکہ ان کے والد حافظ محمد انور، ولیِ کامل محدثِ کبیر حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں اور ان کی والدہ حضرت کامل پوریؒ کی پوتی اور محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی نواسی ہیں۔ حافظ سفیان کا خانوادہ علمی خانوادہ ہے۔

اس خاندان کی شروع سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ علماء و مشائخ کا مرجع اور مقتدا رہا ہے۔ آپ کے پڑ دادا حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ اپنے وقت کے ولیِ کامل، رہبرِ شریعت اور پیرِ طریقت تھے، علومِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے، خصوصاً علم حدیث پر خوب دسترس حاصل تھی۔ صرف علوم کے ہی ماہر نہیں تھے، بلکہ سلوک و معرفت کے بھی امام تھے، بقول حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ:

''حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی جامع صفات ہستی تھی، ایک طرف حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے فیضیابی، دوسری طرف حضرت مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ، تیسری طرف حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہِ معرفت سے سرشار تھے۔ سہارنپور، دیوبند، تھانہ بھون تینوں آستانوں سے فیض حاصل کیا۔'' (تجلیاتِ رحمانی، ص:۳۸)

حافظ سفیان رحمۃ اللہ علیہ کے دادا مولانا عبیدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بھی جید عالم دین تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ انتہائی متواضع اور علم دوست انسان تھے۔ آپ کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم مظاہر العلوم سہارنپور کے روحانی ماحول میں ہوئی اور وہاں کے بڑے بڑے اکابر کی دعائیں، توجہات اور سرپرستی ان کو حاصل رہی۔ آپ کی فراغت دارالعلوم ٹنڈوالہ یار سے ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں آپ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن سے وابستہ ہوئے۔ پانچ سال تک یہاں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں کام کیا۔ پھر اپنے والد محترم کی خدمت کے لیے گاؤں چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں اپنے والد محترم اور حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے انگلینڈ چلے گئے اور وہاں مسلمانوں کی دینی رہنمائی شروع کی اور وہاں اپنے بزرگوں کی توجہات اور سرپرستی کی بدولت، اسلام اور اسلامی اقدار کی سربلندی کے لیے بے مثال خدمات انجام دیں۔ وہاں آپ نے مساجد قائم کیں، نوجوان نسل کے لیے دینی تعلیم کے مرکز اور مکاتب قائم کیے، وہاں کے علماء کو جمع کیا اور جمعیت علمائے برطانیہ کی بنیاد رکھ کر علماء برطانیہ میں ایک مرکزیت قائم کی اور مسلمانوں کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا، اور جب قادیانیوں نے برطانیہ میں ڈیرے ڈالے تو وہاں مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کی بنیاد رکھنے، وہاں مجلس کا دفتر قائم کرنے اور قادیانیوں کی سرکوبی کے لیے مرکزی کردار ادا کیا۔ حافظ محمد سفیان انور کے نانا امامِ اہلِ سنت حضرت مفتی احمد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ تو علمی دنیا میں معروف ہیں، وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس و شیخ الحدیث، عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے نائب امیر اور بہت سی دینی تحریکات، مدارس، دینی مراکز کے سرپرست اور معاون رہے۔ اور آپ کی نانی محترمہ کے والد محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے کون واقف نہیں! ۔ اس طرح بھائی سفیان کی ذات میں خاندانی شرافت ونجابت اور طرفین سے خیر کثیر جمع ہوگئی تھیں۔

حافظ محمد سفیان انور کو ہمیشہ دادا اور نانا کی شفقت و محبت حاصل رہی، بلکہ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے دادا جان کی زیرِ نگرانی ہوئی اور آپ اپنے دادا کی آغوشِ شفقت میں ہی پروان چڑھے۔ بھائی سفیان نے شیفیلڈ کے قریب نوٹنگھم میں مولانا کمال الدین سواتی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ مدرسہ سے حفظ کیا، ابتدائی کتابیں دادا جان سے گھر میں ہی پڑھیں۔ آپ کو عالم بننے کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آئے تو خود اپنے شوق سے یہیں رُک گئے اور جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں تعلیمی سلسلہ شروع کردیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اپنے والد صاحب کے حکم پر انگلینڈ واپس چلے گئے، کیوں کہ اُن کے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہورہی تھی۔ خیال یہی تھا کہ پاسپورٹ کی تجدید ہوجائے گی اور والدین سے بھی مل لوں گا اور جامعہ میں آکر دوبارہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں گا، مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جب یہ انگلینڈ پہنچے تو بھائی انور نے کہا: آئے ہو تو ہسپتال جا کر چیک اَپ بھی کروالو، کیونکہ حافظ محمد سفیانؒ کے پیشاب میں بچپن سے ہی پروٹین کا اخراج زیادہ ہوتا تھا۔

حافظ محمد سفیانؒ نے جب ہسپتال پہنچ کر اپنے گردوں کا معائنہ کروایا تو معلوم ہوا کہ دونوں گردے فیل ہوچکے ہیں، یوں مزید دینی تعلیم کا سلسلہ آگے جاری نہ رہ سکا، مگر عصری تعلیم وہاں کے مطابق مکمل کی۔ اپنے دادا جان سے حصولِ علم کا سلسلہ جاری رکھا اور جب مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ کو ڈاکٹروں نے آرام کرنے اور تبدیلیِ آب و ہوا کا مشورہ دیا تو مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ اور بھائی طلحہ رحمانی کی معیت میں ۲۰۰۱ء میں انگلینڈ کا سفر کیا، آپ نے وہاں ایک ماہ سے زائد قیام کیا تو قاری اسماعیل رشیدی اور مفتی عبدالقادر کی درخواست پر بخاری شریف کا درس شروع کیا تو اس میں بھی حافظ محمد سفیان اکثر و بیشتر شرکت کرتے تھے۔ اس طرح علمِ حدیث سے بھی ان کو نسبت حاصل ہے۔

سات، آٹھ سال ڈائیلیسز ہوتا رہا، پھر گردہ مل گیا تو ٹرانسپلانٹ ہوا، اس گردہ کی تبدیلی کے بعد حافظ محمد سفیان کو ایک اور عارضہ لاحق ہوا کہ ان کے مسلز کمزور ہوگئے، ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ان کے مسلز شروع سے ہی کمزور تھے، اس کا کسی کو بروقت پتا نہ چل سکا اور اس آپریشن کے دوران یہ بیماری زیادہ واضح ہوکر سامنے آئی ہے۔ بہر حال آہستہ آہستہ مسلز بالکل ہی جواب دے گئے کہ حافظ سفیانؒ کے لیے بغیر سہارے کے خود سے چلنا، پھرنا، اُٹھنا، بیٹھنا مشکل ہوگیا، بلکہ بعض دفعہ خود سے کروٹ لینا بھی مشکل ہوتا تھا اور اس طرح پندرہ، بیس سال اسی حالت میں انتہائی صبر و ہمت سے گزارے۔ صبر کا یہ حال تھا کہ کبھی اس کی زبان سے شکوہ، شکایت، جزع وفزع کا لفظ نہیں سنا اور ہمت کا یہ عالم تھا کہ اسی بیماری کے ساتھ علماء، اکابر کی خدمت کرنا، دیگر ملکوں خصوصاً پاکستان سے آنے والے علماء کے پروگرام

کو مرتب کرنا، اپنے گھر بلانا اور مہمان داری کرنا اور اسی بیماری میں سفر کرنا، ختم نبوت کا کام کرنا، اس طرح کے دیگر سارے اُمور جاری وساری تھے۔ اور ان سب اُمور کو خوش دلی سے کرنا اور اس پر خوش ہونا اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا یہ مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ گویا بارگاہِ خداوندی میں زبانِ حال سے وہ عرض کناں تھے:

یاد ہیں تیرے کرم ، تیرے ستم یاد نہیں  خوگرِ شکر ہوں میں ، خوگرِ فریاد نہیں
لب پہ آئی ہو کبھی آہ ، مجھے یاد نہیں  اتنا کم ظرفِ محبت ، دل ناشاد نہیں

حافظ محمد سفیان کا پورا خاندان مہمان نواز رہا ہے، مگر انگلینڈ میں حافظ محمد سفیان کے گھر کو اس مہمان نوازی اور علماء ومشائخ کے مرجع ومرکز ہونے کے حوالے سے خصوصیت حاصل ہے۔ ان کے دادا کی وجہ سے برطانیہ کے علماء کا رجوع تو رہتا ہی تھا، دیگر ممالک خصوصاً پاکستان اور ہندوستان کے علماء کے لیے تو ان کا گھر مہمان خانہ تھا، خصوصاً جب سے برمنگھم (انگلینڈ) میں سالانہ ختمِ نبوت کانفرنس منعقد ہونے لگی اور اس کانفرنس کے لیے کثیر تعداد میں پاکستان، ہندوستان اور دیگر ممالک سے علماء برطانیہ جانے لگے، تو ان کے گھر کو ان تمام علماء کی میزبانی کا شرف حاصل رہا۔ خود حافظ محمد سفیان لکھتے ہیں:

’’(عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت) کی سرپرستی کے لیے پاکستان سمیت پورے برصغیر کی نامور علمی و روحانی شخصیات کا ورودِ مسعود شروع ہوا تو ہمارے دادا کی جانب سے شرفِ میزبانی کی ادائیگی نے ہمارے گھر کو برطانوی مسلمانوں کے لیے مرکز بنا دیا اور الحمدللہ آج تک اسی سعادت کی وجہ سے یہ گھرانہ ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس کی مرکزیت کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ محدث العصر حضرت بنوریؒ، مفکرِ اسلام مفتی محمودؒ، قطب الاقطاب شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ، خواجۂ خواجگان حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ، مفتی اعظم پاکستان مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، حضرت مولانا شاہ ابرار الحقؒ، شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ، فقیہ العصر حضرت مفتی نظام الدین شامزئیؒ، حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ، حضرت سید نفیس شاہ الحسینیؒ، یادگارِ اسلاف حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، قائدِ جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمٰن، تبلیغی جماعت کے مشاہیر حضرت مولانا محمد یوسف، مولانا انعام الحسن، مفتی محمد تقی عثمانی، حضرت مولانا سعید احمد جلال پوریؒ، مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ، حتیٰ کہ عرب کے بڑے بڑے شیوخ، ائمہ حرمین، شیخ الازہر اور قاری عبدالباسط تک ایسی کون سی علمی اور روحانی شخصیت تھی جس کا قیام یہاں نہ ہوا ہو۔‘‘ (شہیدِ ختم نبوت نمبر، ص:۵۷۸)

یہ گھرانہ صرف میزبانی ہی نہیں کرتا تھا، بلکہ میزبانی کرتے ہوئے خوش ہوتا تھا۔ حافظ محمد سفیان اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

’’ان حضرات (مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ اور مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ) کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی ہمارا پورا گھرانہ خوشی ومسرت کے جذبات سے سرشار ہو گیا، بچے تک پُرشوق نگاہوں سے ان کے منتظر تھے، پورے گھر کو جشن کے سے ماحول نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔‘‘ (شہیدِ ختم نبوت نمبر، ص:۵۷۹)

جہاں بھائی انور اور ان کے گھر والوں میں مہمانوں کی خدمت کا جذبہ تھا تو بھائی سفیان بھی اس جذبۂ خدمت سے سرشار تھے، اور ان کو یہ جذبہ راثت میں ملا تھا، انگلینڈ میں تو ہمارا ٹھکانہ خصوصاً کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد ان کے یہاں ہی ہوتا تھا۔ بھائی سفیان کو ہمارے پہنچنے کا انتظار ہوتا تھا اور پہنچنے کے بعد اصرار کہ جب تک انگلینڈ میں ہیں، قیام ہمارے یہاں ہی ہوگا۔ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہٗ سے بھائی محمد سفیانؒ کو بہت عقیدت تھی، حضرت ڈاکٹر صاحب کو بھی ان سے دلی لگاؤ تھا، اس لیے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ کے پروگرام مرتب کرنا، کس دن، کس وقت، کہاں جانا ہے، ہمارے آرام وراحت کا خیال رکھنا، مختلف جگہوں پر ہمارے ساتھ جانا یہ سب کچھ حافظ محمد سفیان نے اپنے ذمہ لیا ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حافظ محمد سفیان کو بہت ہمت دی تھی، جب تک چلنے پھرنے کے قابل تھے، پروگراموں خصوصاً ختمِ نبوت کی کانفرنس میں شریک ہوتے، اسی دوران ایک مرتبہ اپنے شیخ کے ساتھ پورے پاکستان کا سفر کیا، مختلف شہروں میں روحانی مجالس کا اہتمام کیا، ایک مرتبہ اپنے شیخ کو برطانیہ کی دعوت دی اور اپنی نگرانی میں وہاں کے پروگرام منعقد کروائے۔ دو تین سال قبل پاکستان آئے تھے تو مولانا عزیز الرحمٰن رحمانی (جو اُن کے ماموں ہیں) کے اصرار پر کراچی میں ٹھہر گئے۔ اسی بیماری کے ساتھ کراچی سے اپنے گاؤں بہبودی (اٹک) تک کا بائی روڈ سفر کیا۔ ایک ایسا شخص جو خود سے بیٹھ بھی نہ سکتا ہو، اتنا لمبا سفر بڑی ہمت کی بات ہے۔ حافظ محمد سفیان نیک طبیعت اور ذاکر وشاغل انسان تھا، کثرت سے ذکر واذکار کا پابند تھا، دینی کتابیں مطالعہ میں رکھتا تھا۔ جب ماہنامہ بینات نے اُن کے نانا امامِ اہلِ سنت پر خاص نمبر شائع کیا، اس میں میرا مضمون بھی تھا، اس کے کچھ ماہ بعد میں انگلینڈ اُن کے گھر پہنچا تو مجھے خصوصیت کے ساتھ کہا کہ آپ مجھے یہ مضمون پڑھ کر سنائیں، کیوں کہ میں اتنی بھاری کتاب اُٹھا نہیں سکتا۔

طبیعت میں نیکی غالب تھی اور اس معاشرے میں رائج بہت سی برائیوں سے دور تھے، حتیٰ کے آخری کئی سالوں میں اسمارٹ فون بھی رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ انٹرنیٹ بھی ختم کر دیا تھا، حالانکہ ایک ایسا شخص جو چوبیس گھنٹے بستر پر پڑا ہو، جس کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو، جو کہیں آ جا نہ سکتا ہو، اس کی واحد مصروفیت انٹرنیٹ ہی ہوتی ہے، مگر اس نے اپنے آپ کو ان چیزوں سے دور رکھا۔ تصویر کشی کے فتنہ میں

آج کل ہر ایک مبتلا ہے، مگر اس فتنہ سے بھی اس نے اپنے آپ کو بچا رکھا تھا۔ اللہ والوں کی باتیں، ان کی مجالس اور ان کی صحبت اس کے لیے باعثِ تسکین ہوا کرتی تھیں، اسی لیے اس کی خواہش ہوتی تھی کہ علماء وصلحاء اس کے گھر بلکہ اس کے پاس آجائیں۔

کسی خوش طبع سے کیا غرض؟ کسی تنگ ظرف سے کیا کام؟
مری اہلِ دل سے دوستی ، مجھے اہلِ درد سے پیار ہے

آپ کی اسی نیکی، تقویٰ کو دیکھتے ہوئے انجینئر صوفی الحاج شیخ عبدالمنان صاحب جو ایک طویل عرصہ سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں اور حضرت مولانا فقیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں، علماء سے محبت رکھتے ہیں، ان کے دسترخوان پر علماء ومشائخ کا مجمع رہتا ہے، انہوں نے محمد سفیان انور کو خلافت سے نوازا۔

جو گردہ لگایا گیا تھا آخری دنوں میں اس نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا اور دوبارہ ڈائیلیسز شروع ہوا، طبیعت زیادہ بگڑی تو ہسپتال داخل کیا گیا، کئی دن ہسپتال میں داخل رہے، طبیعت بگڑتی چلی گئی، کوئی دوا اور ٹریٹمنٹ کارگر ثابت نہ ہوئی، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، لیکن ہسپتال سے فارغ نہیں کیا۔

ان شاء اللہ! یہ بیماری حافظ سفیانؒ کے لیے کفارۂ سیئات کا ذریعہ ہوگی۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جو بیماری، جو پریشانی، جو بھی رنج وغم اور اذیت پہنچتی ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی اسے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے ذریعہ اس کے گناہوں کی صفائی فرمادیتا ہے، بلکہ یہ بیماری اس کے درجات کی بلندی کا سبب ہوگی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی بندۂ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بلند مقام طے ہوجاتا ہے جس کو وہ اپنے عمل سے نہیں پاسکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی جسمانی یا مالی تکلیف میں یا اولاد کی طرف سے کسی صدمہ یا پریشانی میں مبتلا کردیتا ہے، پھر اس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے، یہاں تک کہ ان مصائب وتکالیف (اور اُن پر صبر) کی وجہ سے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے، جو اس کے لیے پہلے سے طے ہوچکا تھا۔''

اس دوران جو حالات سامنے آئے وہ بہت، اچھے اور حوصلہ افزاء ہیں۔ بتایا گیا کہ کچھ بیماری کا اثر، کچھ دواؤں کا کہ اکثر غشی طاری رہتی، جب ہوش آتا تو بہت حوصلہ اور ہمت سے کام لیتے، بلکہ گھر کے جو افراد مزاج پرسی کے لیے آتے انہیں تسلی دیتے، ان کے والد کی خواہش تھی کہ ان کو پاکستان لے آئیں اور پاکستان میں ہی تدفین ہو، مگر حافظ سفیانؒ نے اپنے والد کو سمجھایا کہ مجھے یہیں دفن کرنا، جہاں چچا جان محمد الرحمٰن مدفون ہیں۔ پاکستان لے جاؤ گے تو آپ کو بہت مشقت اور پریشانی ہوگی، جبکہ شریعت کا بھی یہی حکم ہے کہ جہاں انتقال ہو وہیں تدفین کی جائے۔ یہ بھی وصیت کی کہ میرے جنازہ میں تاخیر نہ کرنا، میری تدفین جلد کردینا، کسی کا انتظار نہ کرنا، میری نمازِ جنازہ مفتی اسلم زاہد

صاحب (امیر جمعیت علماء اسلام، برطانیہ) پڑھائیں گے، انتقال سے ایک دن پہلے ہوش آیا تو سورۂ یٰسین پڑھنا شروع کی، جب پوری سورت پڑھ چکے تو اپنی بہنوں سے کہنے لگے کہ سورۂ یٰسین کی برکت سے مجھے ایک دن اور مل گیا۔ اسی دوران اپنی بہنوں اور پھوپھیوں سے کہنے لگے کہ نانا اور دادا مجھے بلا رہے ہیں۔ پھر اپنے والد صاحب کا پوچھا، بہنوں نے رونا شروع کردیا، اُنہیں تسلی دی اور کہا کہ ہر ایک نے جانا ہے، میرے بعد رونا دھونا نہ کرنا بلکہ صبر کرنا۔ ڈاکٹر حضرات بھی حیران تھے اور انہوں نے کہا کہ اس وقت یہ بہت تکلیف میں ہے، ایک ایک جوڑ درد کرتا ہے، مگر یہ جتنا پرسکون ہیں ہم نے اپنی زندگی میں کم ہی دیکھا ہے۔ آخری دن انتقال سے کچھ دیر قبل ہوش آیا تو بہنوں نے جلدی سے بھائی انور کو اطلاع دی کہ مل لیں۔ تو سفیان نے کہا کہ شاید آپ مجھ سے ناراض ہیں، کیوں کہ میں نے آپ کو پاکستان لے جانے سے منع کیا ہے، تو بھائی انور نے انہیں گلے لگایا اور کہا کہ میں ناراض نہیں ہوں، جیسا آپ کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ اتنے میں والدہ بھی آگئیں ان سے بھی گلے ملا، والدہ نے تسلی دی کہ ان شاء اللہ! ٹھیک ہوجاؤ گے۔ اسی دوران ایمانِ مفصل، ایمانِ مجمل پڑھتا رہا اور پڑھتے پڑھتے باتیں کرتے ہوئے اس دنیا سے منہ موڑ لیا، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ما أعطٰی و کل شییء عندہٗ بأجل مسمّٰی.

بہنوں کا اصرار تھا کہ بھائی کی خواہش کے مطابق جلد تدفین کردی جائے، کسی کا انتظار نہ کیا جائے، یہی سوچ کر ظہر کے بعد جنازہ کی بات ہونے لگی۔ سب نے کہا یہ ممکن نہیں، کیوں کہ اگر جلدی بھی کی جائے تو کاغذی کارروائی کرنے میں دس بارہ گھنٹے لگ جائیں گے اور آج تو ہفتہ کا دن ہے، ویسے ہی دفاتر بند ہیں۔ لیکن اللہ کی شان کہ جو کام گھنٹوں میں ہونا تھا وہ منٹوں میں ہوگیا اور اسی طرح قبر کی تیاری بھی ہوگئی۔ غسل، تجہیز و تکفین سب کام بروقت ہوتے چلے گئے۔ ظہر کے بعد مولانا ضیاء الحق کے قائم کردہ مدرسہ ومسجد الہدیٰ میں جنازہ ہوا، اس قلیل وقت میں ہزاروں لوگ جمع ہوگئے، مفتی اسلم زاہد (امیر جمعیت علماء اسلام، برطانیہ) نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

اس طرح یہ تھکا ماندہ مسافر اپنی منزل جا پہنچا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، خصوصاً بھائی انور اور ان کی اہلیہ کو بہت زیادہ صبر عطا فرمائے، کیونکہ بھائی انور، سفیان کی والدہ اور بھائی، بہنوں نے سفیان کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔ سفیان ان سب کا لاڈلا اور پیارا تھا، اللہ تعالیٰ انہیں یہ صدمہ سہنے کی ہمت عطا فرمائے۔

چلے سوئے خلدِ بریں سب کے پیارے　　　اکابر کا عزت نشاں اللہ اللہ
الٰہی تو برسادے رحمت کی بارش　　　کہ قبر ان کی ہو گلستاں اللہ اللہ

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

# سپر مارکیٹ میں مخصوص خریداری پر ملنے والے کارڈ اور پوائنٹس پر ڈسکاؤنٹ کا حکم

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

امتیاز سپر مارکیٹ میں پندرہ ہزار (15000) کی خریداری پر امتیاز کا کارڈ ملتا ہے، پھر اس کے استعمال کرنے پر مفت پوائنٹ ملتے ہیں، پھر بعد میں یہ پوائنٹ بل کی ادائیگی کے لیے پیسوں کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔

اس کا کیا حکم ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس کارڈ کو استعمال کرنے سے ڈسکاؤنٹ ملتا ہے۔مفت پوائنٹ (بغیر کسی عوض کے) ملتے ہیں، پھر مذکورہ پوائنٹس کے بدلے ''ڈسکاؤنٹ'' ملتا ہے۔
مستفتی: عبدالرافع (گلشن اقبال، کراچی)

## الجواب حامدًا ومصلیًا

واضح رہے کہ بعض دکاندار اپنے سامان کو زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کے لیے لوگوں کو ترغیبات دیتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی گاہک ان کی دکان سے ان کی مقرر کردہ مقدار تک کا سامان خریدتا ہے تو اسے ایک کوپن یا کارڈ دیا جاتا ہے، پھر مزید خریداری پر اس کارڈ پر پوائنٹس ملتے ہیں اور ان پوائنٹس کے عوض اسے ڈسکاؤنٹ ملتا ہے، تو اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر دکاندار سامان کی وہی قیمت لیتا ہے جو عام طور پر بازار میں ہوتی ہے تو مذکورہ کارڈ کا لینا اور اس کا استعمال کرنا شرعاً جائز ہے اور اس کے ذریعہ ملنے والے فوائد اور ڈسکاؤنٹ دکاندار کی طرف سے تبرُّع ہے، جو کہ شرعاً جائز ہے۔ ''کشف الأسرار'' میں ہے:

’’لأن التّبرُّع إنما صار مشروعًا في حقہٖ لكونہٖ وسيلة إلى التجارة في المستقبل.‘‘ (کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، باب الامور المعارضة على الأهلية، باب معرفة اقسام الاثبات والعلل والشروط، ج:۴، ص:۳۰۳، الناشر: دار الکتاب الاسلامی)

’’فقه البيوع‘‘ میں ہے:

’’الثالث: ماجرى به عمل بعض التجار أنهم يعطون جوائز لعملائهم الذين اشتروا منهم كمّيّة مخصوصة، ولو في صفقات مختلفة. وقد تعطي هٰذه الجوائز بقدر الكمّيّة لكل أحد، وقد تعطى الجوائز بالقرعة. وليس هٰذا من قبيل الزيادة في المبيع لأنها تعطى عادة بعد صفقات متعددة في أزمنة وأمكنة مختلفة، فلاسبيل إلى نسبتها إلى مبيع واحد. فهي هبة مبتدأة موعودة من البائع لتشجيع الناس على أن يشتروا البضائع منه. وجواز أخذها مشروط بأن لايكون البائع زاد في ثمن البضعة من أجل هٰذه الجوائز، وإلا صار نوعا من القمار، لأن مازاد على ثمن المثل إنما طولب بہٖ على سبيل الغرز، واحتمال أن يفوز المشتري بالجائزة.‘‘ (فقہ البیوع علی المذاہب الأربعۃ، الجزء الثانی، ص:۸۱۱، المبحث الثامن: تقسیم البیع من حیث ترتب آثارہ، الباب الاول فی احکام البیع الصحیح بدون خیار الجوائز علی المبیعات)

فقط واللہ اعلم

| | | |
|---|---|---|
| الجواب صحیح | الجواب صحیح | کتبہ |
| ابوبکر سعید الرحمٰن | محمد انعام الحق | تقی الدین شامزی |
| | الجواب صحیح | دار الافتاء |
| | محمد عبد القادر | جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی |

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ....

القلم کمپوزنگ سینٹر
درج ذیل کاموں کے لیے رابطہ کریں
معیاری اردو اور عربی کمپوزنگ
اردو، عربی کتابوں کی پروف ریڈنگ اور تصحیح
اردو، عربی کتابوں کی ایڈیٹنگ اور سیٹنگ
عربی سے اردو ترجمہ
فون نمبر 0313-1202667
Email: alqalamcomposing@gmail.com

# نَقدُ و نظَر



ادارہ

## فیضِ حسن واشرف (سوانح حضرت مولانا فقیر محمد پشاوریؒ)

ترتیب وتالیف: حضرت مولانا نجم الحسن تھانوی۔ صفحات: ۳۰۲۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: دارالتصنیف جامعہ امداد العلوم الاسلامیہ، جامع مسجد درویش، پشاور

حضرت مولانا فقیر محمد نور اللہ مرقدہٗ (ولادت: ۱۹۱۱ء، متوفی: ۱۹۹۱ء) حضرت مولانا مفتی محمد حسن اور حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہما کے تربیت یافتہ اور خلیفہ مجاز تھے۔ خشیتِ الٰہی اور خوفِ خدا سے کثرت سے آہ وبکا کرتے تھے، جس کی بنا پر آپ کا لقب ہی ''بَکّاء'' پڑ گیا۔ یہ کتاب ۲۷ سال پہلے تحریر کی گئی تھی، اور اب تقریباً نایاب ہوگئی تھی، اس کو نئی کمپوزنگ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: ۱:- ابتدائی حالات، ۲:- حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت بابرکت میں حاضری اور بیعت واصلاحِ باطنی، ۳:- شیخین کی نظرِ عنایت وتوجہ، ۴:- مختلف واقعات، ۵:- خطوط، ۶:- ملفوظاتِ حکیم الامتؒ منتخب کردہ حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ۔

اکابر علمائے کرام، اولیاء عظام اور مشائخ کے حالاتِ زندگی اس لیے شائع کیے جاتے ہیں کہ اُن کے حالاتِ زندگی، دین میں اُن کی محنت اور زندگی بھر اس پر عمل بعد میں آنے والے افراد کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے، لیکن املائی اغلاط اس میں کچھ رہ گئی ہیں۔ امید ہے اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر لی جائے گی۔

## اُمتِ مسلمہ کی تاریخ ساز مائیں

مولانا محمد ریاض انور گجراتی۔ صفحات: ۷۶۵۔ قیمت: درج نہیں۔ ملنے کا پتا: مسجد صحابہ کرامؓ، احسن ٹاؤن کنگنی والا، نزد ریلوے پھاٹک، گوجرانوالہ

قرآن کریم کا ارشاد ہے: ''اَلنَّبِيُّ أَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهٗ أُمَّهَاتُهُمْ .''

ترجمہ: ’’نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں ان کی مائیں ہیں۔‘‘

خطیب آلِ محمدؐ حضرت مولانا محمد ریاض انور گجراتی حفظہ اللہ تعالیٰ جامعہ نصرۃ العلوم کے فاضل، بہترین واعظ وخطیب اور لاجواب ادیب ہیں۔ ان کے فیضِ قلم سے کئی کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِتبصرہ کتاب ’’اُمتِ مسلمہ کی تاریخ ساز مائیں‘‘ میں اُمہات المؤمنین اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاروں صاحبزادیوں، آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ سعدیہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب، سیدہ ام الخیر بنت صخر، سیدہ ام رومان، حضرت اسماء بنت ابی بکر، سیدہ فاطمہ بنت خطاب، سیدہ اروىٰ بنت کریز، زوجہ حضرت عثمان ذوالنورین حضرت نائلہ، سیدہ سعدی بنت کریز، سیدہ سلافہ بنت سعد جیسی صحابیات رضی اللہ عنہن کے حسین تذکروں کو اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

کتاب ایسی ہے کہ ایک بار اُسے پڑھنا شروع کیا جائے تو بند کرنے کا جی نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو جزائے خیر عطا فرمائے، میں قارئین بینات سے درخواست کروں گا کہ وہ اس کتاب کو ضرور اپنے گھر کی لائبریری کا حصہ بنائیں اور گھر کی مستورات روزانہ اس کی تعلیم کرکے گھر کی بچیوں کو سنائیں، ان شاء اللہ! اس سے بچیوں کی بہت اچھی تربیت ہوگی۔

## تذکرۂ اکابر ومشائخ ودارالعلوم

مفتی محمد وہاب منگلوری حقانی۔ صفحات: ۲۵۸۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: گورنمنٹ دارالعلوم اسلامیہ سیدو شریف، سوات۔

گورنمنٹ دارالعلوم اسلامیہ، سیدو شریف سوات کا ترجمان مجلّہ ’’التـــنسیـــق‘‘ نے رجب ۱۴۴۰ھ مارچ ۲۰۱۹ء کا یہ خصوصی نمبر ’’تذکرۂ اکابر ومشائخ ودارالعلوم‘‘ بسلسلہ ختم بخاری شریف ودستار بندی فضلاء ۱۲ اپریل ۲۰۱۹ء نکالا ہے۔ یہ ادارہ تقریباً ستر سال سے اپنے علاقہ میں دینِ متین کی خدمت وتحفظ کا کام کررہا ہے، جس کے اساتذہ بڑے بڑے اکابر ومشائخ رہے ہیں۔ اس رسالہ کے مدیر حضرت مولانا مفتی محمد وہاب منگلوری صاحب حفظہٗ اللہ نے چاہا کہ اپنے فضلاء وطلبہ اور عام لوگوں کو ان اکابر اساتذہ سے روشناس کرایا جائے۔ اس ارادہ سے انہوں نے ایک سوال نامہ بنایا اور سب مشائخ اور ان کے اخلاف کے پاس بھیجا، کچھ نے جواب دیا اور کچھ نے توقف کیا، جن بزرگوں کے حالات انہیں دستیاب ہوئے، ان کو اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وادیِ سوات کے کچھ حالات بھی اس کتاب میں آگئے ہیں۔ مطالعہ کا ذوق رکھنے والے احباب کے لیے یہ کتاب عمدہ سوغات ہے۔

## انوارِ حق (چار حصے)

افادات: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد انوار الحق مدظلہٗ۔ صفحات حصہ اول: ۳۰۴۔ صفحات

حصہ دوم: ۳۳۶۔صفحات حصہ سوم: ۳۵۲۔صفحات حصہ چہارم: ۳۶۸۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: القاسم اکیڈمی، جامعہ ابو ہریرہؓ، خالق آباد، نوشہرہ۔

زیرِتبصرہ کتاب حضرت مولانا انوارالحق صاحب مدظلہٗ (مرکزی نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان، و مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک) کے علمی اور اصلاحی خطبات کا مجموعہ ہے، جسے مولانا حافظ سلمان الحق حقانی صاحب نے حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کی زیرنگرانی ترتیب دیا ہے۔ یہ خطبات حضرت مولانا انوارالحق مدظلہٗ نے جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی مسجد میں اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالحقؒ کی وفات کے بعد ان کے منبر ومحراب پر ارشاد فرمائے ہیں۔ حضرت موصوف کی خاندانی حیثیت، علمی اور انتظامی صلاحیتیں اہل علم میں معروف ہیں۔ زیرِنظر خطبات سے ان کی عمدہ خطابت اور وعظ ونصیحت کی شان نمایاں ہوتی ہے۔ یہ مجموعہ چار حصوں پر مشتمل دوجلدوں میں شائع ہوا ہے، چاروں جلدوں کے کل صفحات ۱۳۶۰ ہیں۔ کتاب کا ٹائٹل خوبصورت، جلد مضبوط اور کاغذ مناسب ہے۔

خطبات کا یہ مجموعہ اہم دینی، اصلاحی اور علمی موضوعات پر معلومات کا بیش بہا ذخیرہ اور علماء، خطباء، مبلغین اور عوام الناس کے لیے یکساں مفید ہے۔ یہ گلدستہ سلسلۂ دعوت وارشاد میں ایک خوبصورت اور مفید اضافہ ہے۔ ان شاء اللہ! یہ خطبات ومواعظ ایک امام وخطیب کو کافی حد تک سیراب اور مستغنی کرسکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ علماء وخطباء دیگر اکابرین کے مواعظ کی طرح ان مواعظ سے بھی استفادہ کریں گے۔

## ’’البصائر‘‘ اردو ترجمہ ’’الأشباہ والنظائر‘‘ (حصہ اول)

تالیف: العلامہ زین الدین بن ابراہیم المعروف بابن نجیم الحنفیؒ۔ اردو ترجمہ: مولانا وکیل احمد سکندر پوریؒ۔ تسہیل واضافہ عنوانات: مفتی محمد سلیم صاحب۔ صفحات: ۳۸۵۔ ناشر: شعبۂ تصنیف وتالیف: جامعہ اسلامیہ تعلیم القرآن، مسجد الفلاح، پی.ای.ایس.ایچ.ایس، بلاک ۲، کراچی۔ ملنے کا پتہ: اسلامی کتب خانہ بالمقابل بنوری ٹاؤن کراچی، ومکتبہ غزنوی، سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن کراچی۔

زیرِتبصرہ کتاب ’’الأشباہ والنظائر‘‘ کا اردو ترجمہ ہے۔ ’’الأشباہ والنظائر‘‘ اہل علم کے ہاں مشہور ومعروف کتاب ہے، جو فقہی قواعد وقوانین پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب برصغیر پاک وہند میں تخصص فی الفقہ والافتاء کے نصاب میں بھی شامل ہے اور اس کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے، جس کی عبارت بھی کسی قدر مغلق ہے، اس کی افادیت کو مزید بڑھانے اور نفع عام کرنے کے لیے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل مولانا وکیل احمد سکندر پوریؒ نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا، مگر ترجمہ پرانی اردو میں تھا اور کہیں کہیں ناقص بھی تھا، اس لیے ازسرِنو ترجمہ پر نظر ثانی کی گئی، اور ترجمہ کے ساتھ تسہیل وتشریح کا

بھی اہتمام کیا گیا، یہ سب کام حضرت مولانا قاری محمد ضیاء الحق صاحب مدظلہٗ کی زیرنگرانی سرانجام پائے۔ عربی متن بھی تصحیح شدہ شامل کیا گیا ہے۔ اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جس صفحہ پر جتنا متن ہو، اسی کا ترجمہ بھی ہو۔ تاحال ترجمہ کا پہلا حصہ طبع ہوا ہے، دوسرا حصہ بھی عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ کتاب کا کاغذ اعلیٰ، ٹائٹل دیدہ زیب، اور طباعت دورنگی ہے۔ ماشاء اللہ ! کتاب ظاہری ومعنوی خوبیوں سے مزین ہے۔ اُمید ہے کہ مترجمین، مسہّلین، مرتبین، مصححین اور ناشر کی اس محنت وکاوش کی قدرافزائی کی جائے گی، فجزاهم الله خيرا وأحسن الجزاء۔

## مجیب الفتاویٰ

مفتی مجیب الرحمٰن۔ صفحات: ۳۴۸۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: الحسنین ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) راولپنڈی

مفتی مجیب الرحمٰن صاحب (بانی ومدیر جامعہ دارالعلوم محمدیہ راولپنڈی) اپنے دارالافتاء اور مختلف قومی روزناموں کے لیے مسائل کے جوابات لکھتے رہتے ہیں۔ زیرِنظر کتاب مفتی صاحب کے اُن فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو روزنامہ اوصاف اور ہفت روزہ القلم میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب الطہارۃ، ارکانِ اربعہ (صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج) قربانی، کتاب الحظر والاباحۃ اور متفرق مسائل کے عنوانات اِن فتاویٰ کے مرکزی موضوعات ہیں۔

ماشاءاللہ! تمام مسائل مدلل بیان کیے گئے ہیں۔ تحریری اور فقہی ذوق بھی اچھا ہے۔ اُمید ہے کہ مفتی صاحب کی اس محنت کی قدر کی جائے گی۔ کتاب کا کاغذ اعلیٰ، ٹائٹل خوبصورت اور جلد مضبوط ہے۔

## باب الریان، فضائل واحکام رمضان

مرتبہ: حضرت مولانا قاری فتح محمد پانی پتیؒ۔ تصحیح وتخریج: مفتی احسان الحق۔ صفحات: ۹۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبۃ الحذیفہ، بالمقابل جامعہ اشرف المدارس، گلستانِ جوہر، کراچی

زیرِنظر رسالہ رمضان المبارک اور اس کے خاص اعمال کے فضائل واحکام سے متعلق ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس رسالے کو پڑھ کر ایک مسلمان کے دل میں رمضان اور اس کے مخصوص اعمال کی اہمیت ورغبت پیدا ہوتی ہے اور ان کی درست طریقہ پر ادائیگی کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ رسالہ کافی عرصہ پہلے شائع ہوا تھا۔ اب مفتی احسان الحق صاحب (فاضل جامعہ بنوری ٹاؤن) نے اس کو تحقیق وتخریج کے ساتھ ازسرنو شائع کیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرتب، محقق اور ناشر سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سب کو رمضان المبارک کی رحمتیں اور برکتیں سمیٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## محدثین کے مسلَّم امام سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب: مولانا علی محمد قاسمی۔ صفحات: ۹۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: جامعہ اسلامیہ کلفٹن، کراچی

فقہ کے ائمہ اربعہ حدیث میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے، سلفاً وخلفاً اس میں کوئی معتبر اختلاف نہیں تھا۔ بعد کے زمانوں میں میں ظہور پذیر ایک طبقہ حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف یہ پروپیگنڈا کرتا ہے کہ حضرت الامامؒ کو حدیث سے کوئی شغف ودرک نہیں تھا، اس خلافِ حقیقت اور بے بنیاد اعتراض کے جواب میں پہلے بھی بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، زیرِنظر رسالے کے مرتب جناب مولانا علی محمد قاسمی صاحب نے بھی اس موضوع پر یہ کتابچہ لکھ کر امام صاحبؒ کے مدافعین میں اپنا نام شامل کرادیا ہے۔ مرتب موصوف نے فقہاء کرام اور محدثین عظام کی تائیدات وتصدیقات اور مکمل حوالہ جات کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرنے میں ماشاء اللہ! اچھی محنت کی ہے اور بہترین مواد جمع کیا ہے۔ کتابچہ میں امام صاحبؒ کے حدیث میں مرتبے اور سند حدیث کی وضاحت کے لیے ۱۳ نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ کتاب کا ٹائٹل دیدہ زیب، کاغذ اعلیٰ اور طباعت دورنگی ہے۔

## خادمانِ قرآن

مؤلف: مولانا محمد جمال۔ صفحات: ۱۱۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: حافظ محمد غیور عظیم۔ ملنے کا پتہ: نفحۃ القرآن، کراچی

زیرِتبصرہ کتابچہ قرآن کریم کی خدمت کرنے والے قراء کرام کے مختصر تعارف وتذکرہ پر مشتمل ہے۔ قراء کرام کی مختلف انواع واقسام کے اعتبار سے عنوانات قائم کرکے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً چند عنوانات یہ ہیں: قراء صحابہؓ کے القابِ قرآنیہ، مشاہیر صوفیاء قرائے کرام، مشاہیر علماء قرائے کرام، مشاہیر مفسرین خادمینِ قرآن، مشاہیر عُمیان خادمانِ قرآن، ''بخش'' نامی مشاہیر قرائے کرام، مشاہیر شعراء قرائے کرام، خادمانِ قرآن ائمہ اربعہؒ، حفاظ الاحادیث اکابر قرائے کرام، قلیل المدت حفاظِ قرآن، طویل العمر قرائے کرام، وغیرہ۔

کتابچہ جیبی سائز ہے۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ماشاء اللہ! کمپوزنگ، سیٹنگ، کاغذ، جلد بندی اور ٹائٹل تمام چیزیں عمدہ اور اعلیٰ ہیں۔ کافی محنت سے بہترین مواد جمع کیا گیا ہے۔ قرآن کریم سے شغف رکھنے والوں اور قراء کرام کو بالخصوص اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔